رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۲۴۰

جلد ۵٦ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ٦ روپے قیمت فی پرچہ ٦٢ پیسے

ہماری نئی مطبوعات

حسب ذیل کتب نئی طبع ہوکر آگئی ہیں - اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیں

۱- اذکار مسنونہ از امام ابن قیم رح قسم اعلیٰ مجلد معہ گردپوش		۴-۰۰	روپے
" "	سستا ایڈیشن	۲-۵۰	"
۲- خطبات (پندرھواں ایڈیشن) از مولانا مودودی قسم اعلیٰ مجلد		۴-۲۵	"
" "	سستا ایڈیشن	۲-۷۵	"
۳- تجدید و احیائے دین (بعد نظر ثانی و اضافہ) قسم اعلیٰ مجلد		۲-۵۰	"
" "	سستا ایڈیشن	۱-۷۵	"
۴- حقوق الزوجین (ساتواں ایڈیشن) از مولانا مودودی قسم اعلیٰ		۲-۵۰	"
" " "	سستا ایڈیشن	۱-۷۵	"
۵- سود (بعد نظر ثانی و اضافہ) "	قسم اعلیٰ	۵-۵۰	"
" " "	سستا ایڈیشن	۳-۲۵	"
۶- دین کی باتیں از مولانا عبدالحی		۲-۰۰	"
۷- بیمۂ زندگی از نعیم صدیقی		۵۰	پیسے
۸- موتیوں کا ہار (بچیوں کے لئے بہترین تحفہ)	حصہ اول	۳۱	"
" " "	دوم	۳۴	"
" " "	سوم	۳۴	"
" " "	چہارم	۴۴	"
۹- تفہیم القرآن جلد اول مجلد پارچہ قسم اول		۲۱-۲۵	روپے
" "	قسم عام	۱۶-۲۵	"

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ

۱۱- سی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۶ | اگست سنہ ۱۹۶۱ء | عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

اسلام میں سنّت نبوی کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس سے ہر وہ شخص آشنا ہے۔ جس نے اسلامی عقائد و عبادات اور اسلامی تہذیب و تمدّن کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے۔ سنّت کا یہ بیش قیمت ذخیرہ جو ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا ہے اور جس کی حفاظت و پاسبانی ہر دور میں امّت کے نامور آئمہ اور صلحاء نے کی ہے، ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ ہمارا مبداء اور جوہر حیات ہے یہ اُس مقدس ذات کی پاکیزہ زندگی کا مستند ریکارڈ ہے جس نے ہمیں اپنے مالک اور خالق کا شعور و احساس بخشا، ہمیں اس کے ارادہ اور منشا سے آگاہ کیا اور پھر اس کے احکام کو بالفعل دین میں نافذ کر کے اُن کے عملی پہلوؤں سے ہمیں پوری طرح روشناس کرایا۔ اس بنا پر حضوؐر کی حیات طیبہ محض ایک مقدس اور تاریخی شخصیت کی داستانِ حیات نہیں بلکہ احکام ربانی اور ان کے مضمرات کو سمجھنے کا ایک نہایت ہی قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ آپ اگر اپنی انفرادی زندگی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اسلام نے اس کے متعلق جو ہدایات ہمیں دی ہیں وہ نوے فیصد سنت سے ماخوذ ہیں۔ پھر سنّت ہی ہماری ہیئت اجتماعی کی تشکیل میں ایک مؤثر قوت کی حیثیت سے شامل ہے۔ فرد اور جماعت کے باہمی تعلق میں، حاکم اور محکوم کے حقوق و فرائض کے تعیّن میں، نظامِ عدالت کے قیام میں اور نظم حکومت کے چلانے میں، الغرض انفرادی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر حیات اجتماعی کے بڑے بڑے مسائل تک ہمارے سامنے اسلام کا جو ہمہ گیر پروگرام موجود ہے اس میں سنّت نبوی ایک مؤثر عنصر کی حیثیت سے شامل ہے۔

یہی نہیں بلکہ سنّت ہی ہمارے پاس ایک ایسا مستند ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم اپنے تاریخی پس منظر کو دیکھ سکتے ہیں اور پھر اس پس منظر کی روشنی میں، ماضی اور حال کی کامرانیوں اور محرومیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی پس منظر نے اس ملّت بیضاء کو ایک ملی وجود بخشا ہے اور اسی کی حیات آفریں شعاعوں کے نور سے ہم اپنی مستقبل کی راہیں منوّر کرتے ہیں کامیاب ہوئے ہیں اگر ہم سنّت کی ضیا پاشیوں سے ایک دفعہ محروم کر دیئے گئے تو ہمارے لیے حق و باطل اور خوب و ناخوب کے درمیان امتیاز کرنا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔

عقائد کے علاوہ اوامر و نواہی کے جس صحت مند نظام نے ہمیں دوسری اقوام سے ممیّز اور ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کا بیشتر حصّہ ہمیں سنّت نبوی کے خزانہ عامرہ سے ہی حاصل ہوا ہے۔ عقائد کے مضمرات بیان کرتے ہیں، عبادات کی جزئیات اور ان کی عملی صورتیں متعیّن کرتے ہیں، وضو اور طہارت کے باریک سے باریک مسائل سمجھاتے ہیں اور حلال و حرام کی حدود و قیود کی پوری پوری تفصیلات طے کرنے میں ہمیں ہر گام پر سنّت نبوی کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے یہی وہ شعبے ہیں جنہیں ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی وجہ سے ہم ایک الگ قوم کی حیثیت میں دنیا میں زندہ ہیں۔ جن چیزوں کو ہمارے اس دور کے مجتہدین بیکار کی زنجیروں سے تعبیر کرتے ہوئے لوگوں کو انہیں اتار پھینکنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ انہوں نے ہی اس امت کے مائل بہ انتشار اجزاء کو باہم جوڑ کر اسے فکری اور عملی یک جہتی عطا کی ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ اگر ہمارے سامنے اسلامی تہذیب اپنی پوری جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ جلوہ گر نہ ہوا ہم قرآن مجید کی تعلیمات کو بڑی آزادی کے ساتھ ہر دور کے تہذیبی سانچوں میں ڈھالتے چلے جائیں تو امت مسلمہ کی حیثیت سے ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے یہ معاشرتی ڈھانچے جنہیں یہ مغرب پرست گروہ اسلاف کے بندھنوں سے تعبیر کرتا ہے۔ درحقیقت ہمارے وہ مضبوط قلعے ہیں جنہوں نے ہر دور میں ہمیں غیر اسلامی اقدار کے طوفانوں سے محفوظ رکھا۔ ہماری زندگی انہیں

کے استحکام سے وابستہ ہے اور اگر خدا نخواستہ ان قلعوں میں کوئی شگاف پیدا ہو گیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس امت کو غیروں کی دستبرد سے بچا نہ سکے گی۔

معتقدات و تصورات کا امتیاز اپنی جگہ صحیح اور درست سہی اور اس کی اہمیت بھی مسلّم لیکن یہ دیکھئے کہ محض نظریات عوام کو ایک سلک میں منسلک رکھنے میں کہاں تک ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان نظریات کی حیثیت جڑوں کی سی ہے جو دل و دماغ کی تہ میں پیٹھے ہوئے کسی تہذیب و تمدّن کو فکری غذا تو مہیا کرتے رہتے ہیں لیکن ایک عام انسان کے اندر اس جڑ کے وجود اور اس کی افادیت کا احساس اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اس کی پشت پر تہذیب و تمدن کا ایک خاص درخت اپنی آنکھوں سے برومند ہوتا ہُوا دیکھے اور پھر اسے اس کے سایہ میں سکون حاصل کرنے کا موقع بھی فراہم ہو۔ مجرّد نظریات لوگوں کے لیے کسی طرح بھی باعث کشش نہیں ہوتے۔ یہ نظریات لوگوں کی نظروں کو اسی وقت مفتوح کرتے ہیں جب انہیں اس امر کا احساس ہو کہ ان تصوّرات کے بطن سے ایک ایسی تہذیب معرضِ وجود میں آئے گی جو سرتاپا دوسری تہذیبوں سے ممیز ہوگی اور اگر انہیں یہ باور کرا دیا جائے کہ ان نظریات کو جنہیں تم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہو ہر قسم کی تہذیب و تمدّن کو تشکیل دینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے تو پھر ان کے دلوں سے تصورات کی امتیازی حیثیت کا نقش خود بخود محو ہونے لگے گا۔

قرآن پاک اور احادیثِ نبوی کا تعلق الفاظ و معانی کا سا تعلق ہے جس طرح کسی لفظ کے ظاہری ڈھانچہ اور اس کے مطالب و معانی کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی بالکل اسی طرح قرآن اور ارشاداتِ نبوی کو بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں ہمیں اسلامی نظامِ حیات کا مکمل خاکہ عطا کیا ہے اور اسی ذات برحق نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس خاکہ میں اپنی ہدایت کے مطابق رنگ بھی بھر وا دیئے ہیں۔ یہ رنگ بھی اسی نقشہ کا ضروری

جز رہے اور اس کی بھی دین میں اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ خود خاکہ کی ہے۔ اگر مشیت ایزدی اسلامی تہذیب و تمدن کے اس خاکے میں ہمیں رنگ بھرنے کے معاملے میں خود مختار خیال کرتی تو پھر قرآن مجید کے ساتھ رسول اور ہادی مبعوث نہ فرماتی بلکہ ایک عدد لغات القرآن نازل کرتی تاکہ غیر عرب قومیں اس کے منشا کو بآسانی سمجھ سکیں۔

قرآن کی تبیین کے لیے ایک جلیل القدر نبیؐ کا انتخاب اس بات کی واضح شہادت ہے کہ یہاں اصل معاملہ مشکل الفاظ کی تشریح و تاویل کا نہیں بلکہ خالق و مالک کے ارادہ کو دنیا میں نافذ کرنے کا ہے۔ بلند و بالا ذات جس نے وحی کے ذریعہ اپنے نبیؐ کو قرآن مجید جیسی لاثانی اور غیر فانی کتاب عطا کی اسی ذات نے ہی اس مقدس انسان کے سپرد اس کی تشریح و تفسیر کا کام بھی کیا۔ قرآن مجید اور سنّتِ نبوی دونوں کا ماخذ اور سرچشمہ ایک ہی ہے۔ پھر امت کی جن مقدر ہستیوں کی وساطت سے ہم تک کلام ربّانی پہنچا ہے، انہیں مقدر شخصیتوں کی کوششوں سے سنّت نبوی کا ذخیرہ جمع ہوا ہے اور انہیں کے محتاط ہاتھوں سے یہ خزانہ نَسلاً بعدَ نسلٍ ہم تک منتقل ہوتا چلا آیا ہے

اس کے علاوہ سنّتِ نبوی ہمارے پاس ایک ایسا مستند ریکارڈ ہے جس میں ہم اپنی تاریخ کے آئیڈیل دور کی اصل تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ حضور سرور دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خلوت اور جلوت کی مصروفیات، رنج و مسرت کے وقت آپ کا ردّ عمل، اشتعال میں آپ کا ضبطِ نفس، دوستوں اور دشمنوں سے آپ کا سلوک، ایک قاضی کی حیثیت سے آپ کے فیصلے اور ایک جرنیل کی حیثیت سے آپ کی جنگی تدبیریں اور احکام۔ الغرض سرور کائنات کی پر شکوہ اور پر کشش ذات کے سارے تابناک گوشے جن کی متابعت کو قرآن نے ہمارے لیے شرطِ ایمان قرار دیا ہے، احادیث کے مجموعوں ہی سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پھر حضورؐ نے جس معاشرہ کی تشکیل کی اور اُس میں جن جن حضرات نے نمایاں اور اہم حصہ لیا ان کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں احادیث کے ذخیرے سے ہی فراہم ہوئی ہیں۔ اگر احادیث کے یہ مجموعے جنہیں آج منکرین حدیث عجمی سازش کہہ کر دریا برد کرنے کے پیچھے پڑے ہیں

ہمارے ہاں موجود نہ ہوتے تو ہم اس سیہ دور کی کوئی جھلک نہ دیکھ پاتے۔

ہماری ملی روایات، جو ہمارے لیے جسم و جان کی سی اہمیت رکھتی ہیں اور جن کی وجہ سے ہمارے اندر زندگی کی حرارت اور ولولہ اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ایک راہ پر لگانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھی ساری کی ساری سنّت نبوی سے عبارت ہیں۔ دوسری اقوام کے ہاں وہ سارے افعال جنہیں لیل و نہار کی گردشیں مٹانے میں ناکام ثابت ہوں، روایات کا روپ دھار لیتے ہیں۔ صرف وقت ہی انہیں خلعت تقدیس پہنا دیتا ہے۔ ان کے برعکس امتِ مسلمہ کے ہاں جو روایات پروان چڑھی ہیں وہ تقدیس کے لیے مرورِ ایام کے رحم و کرم کی دست نگر نہیں بلکہ حضور سرورِ دوعالم کی تصدیق و تصویب کی محتاج ہیں۔ حضورؐ نے جن باتوں پر پسندیدگی کا اظہار فرما دیا وہی ہماری ملی روایات قرار پائیں اور پوری امت نے پھر انہیں اپنانے کی کوشش کی۔ ہمارے دلوں میں اپنی روایات کے متعلق ایک غیر معمولی جذبہ احترام موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کا تعلق ماضی سے ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات کی بارگاہ اقدس سے انہیں پسندیدگی کی سند عطا ہو چکی ہے۔ پھر انہیں مقدس روایات کے مقدس رشتوں نے ہمیں اپنے ماضی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ ہمارے اندر جو یہ احساس تسلسل کے ساتھ موجود رہا ہے کہ امت مسلمہ ہی اس کرہ ارضی پر ایک ایسی قوم ہے جو اخلاق کے سہارے جینے کا عزم رکھتی ہے اور اسی کے مطابق دنیا کا نظم و نسق چلانے کی متمنی ہے، تو اس کی تہ میں بھی حضور سرورِ دوعالم اور آپ کے رفقائے کار کی محبت و عقیدت کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور اگر یہ جذبہ دلوں سے محو ہو جائے تو ہم ایک خوفناک ذہنی اور عملی انتشار کا شکار ہوں گے۔

اسے ہماری بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ملت کا تجدد پسند طبقہ سنّتِ نبوی کو، جس کی حیثیت ہماری شاہ رگ کی سی ہے، بالکل کاٹ دینے پر تلا ہوا ہے۔ وہ ایک لگے

بندھے منصوبے کے تحت اس امر کا التزام کر رہا ہے کہ کسی طرح مسلم قوم کے دل سے احکام رسول کی حجیّت کا احساس مٹا دیا جائے کیوں کہ وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ جب تک اس قوم کے دل و دماغ میں احادیث نبوی سے وابستگی موجود رہے گی وہ قرآن پاک کی من مانی تاویلات کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اس طبقہ کے افراد دین کے اندر مغربی افکار و نظریات سے مرعوب و مغلوب ہو کر جس قسم کی تحریف کرنا چاہتے ہیں اس راہ میں احادیث کو بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس بات کا عزم بالجزم کر لیا ہے کہ پہلے ان مقدّس مجموعوں کو عجمی سازشیں کہہ کر عوام کے دلوں میں ان کے متعلق معاندانہ جذبات پیدا کیے جائیں اور اگر وہ اس پہلی منزل پر کامیاب ہو گئے تو اس کے بعد کی منازل میں انہیں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ تحریف دین کے سارے راستے پھر خود بخود کھلتے چلے جائیں گے۔ تاریخ کے دوسرے حادثات کی طرح یہ بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ جس ناپاک مہم میں غیر مسلم مستشرقین حکومتوں اور ریاستوں کی تائید کے باوجود ناکام رہے، اس مہم کو آج خود مسلمانوں کا ایک طبقہ سر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے اور اس کے لیے اسلحہ بھی دشمنانِ دین کے اسلحہ خانہ سے فراہم کیا گیا ہے۔

اس قسم کی احمقانہ حرکات کرنے والوں سے تاریخ کا کبھی کوئی دور خالی نہیں رہا۔ ہر عہد میں کچھ سر پھرے لوگ ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے احادیث کے متعلق لوگوں کے اندر مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کیے مگر آج سے پہلے اس قسم کے سر پھروں کو اس بات کی کبھی جسارت نہ پیدا ہوئی تھی کہ وہ احادیث کے خلاف اپنے ان وساوس کو کسی تحریک کی شکل دے دیں۔ ہمارے اس دور کی دوسری بدبختیوں کے علاوہ یہ بھی ایک بہت بڑی بدبختی ہے کہ آج فتنہ انکارِ حدیث ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کر رہا ہے اور اس کی پشت پناہی بعض وہ لوگ کر رہے ہیں جن پر اس فتنے کے سدباب کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ یہ زہر جس

رفتار کے ساتھ ہماری نوخیز نسلوں کے اندر "قرآنی افکار" کے نام سے سرایت کرتا چلا جا رہا ہے وہ حد درجہ تشویش ناک ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم آنکھیں کھولیں اور اس فتنہ کو جلد از جلد دبانے کی فکر کریں۔ اگر اسے خدانخواستہ امت کے اندر راہ پانے کا موقع فراہم ہو گیا تو پھر ہمیں الحاد و زندقہ سے کوئی چیز محفوظ نہ رکھ سکے گی۔ اس معاملے میں ہمارا تساہل ایک مجرمانہ تغافل کے ہم معنی ہے۔

اسی احساس کے پیش نظر ہم نے اگلے ماہ یعنی ستمبر میں ترجمان القرآن کا ایک خاص نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نمبر میں مخدومی مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے حدیث کے متعلق بعض دیگر گراں قدر مقالات کے علاوہ دو خاص مضامین بھی شامل ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا آخری خط اور مولانا محترم کا جواب۔ دوسرا مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے فاضل جج جسٹس محمد شفیع کی اُن آراء پر تبصرہ جو موصوف نے سنّت و فقہ کے بارے میں ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے ظاہر کی ہیں۔ فتنہ انکار حدیث کے علم برداروں نے ڈاکٹر صاحب اور جسٹس موصوف کے خیالات کی جس وسیع پیمانے پر اشاعت کی ہے اس سے اُن کے عزائم کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب سے یہ مہم شروع ہوئی ہے اسی وقت سے لوگ اس بات کا مسلسل تقاضا کر رہے ہیں کہ مولانا محترم ان حضرات کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب دیں۔ اس راہ میں بہت سی مشکلات حائل رہیں مگر مولانا نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنی بے پناہ مصروفیات کے ہجوم میں سے وقت نکال کر ان پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ اس نمبر کی اہمیت کے پیش نظر ہم حامیانِ سنّتِ نبوی سے اس بات کی بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس نمبر کی اشاعت میں پوری پوری دلچسپی لیں گے۔ یہ نمبر غالباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہو گا اور آفسٹ پر شائع ہو گا۔

تفہیم القرآن

السجدہ

(۲)

۲۲ کاش تم دیکھو وہ وقت جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ (اس وقت یہ کہہ رہے ہوں گے) "اے ہمارے رب، ہم نے خوب دیکھ لیا اور سن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے، ہم نیک عمل کریں گے، ہمیں اب یقین آگیا ہے"۔ (جواب میں ارشاد ہوگا) "اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے[۲۳]۔ مگر میری وہ بات پوری ہو گئی جو میں

۲۲۔ اب اس حالت کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے جب اپنے رب کی طرف پلٹ کر یہ انسانی "انا" اپنا حساب دینے کے لیے اس کے حضور کھڑی ہوگی۔

۲۳۔ یعنی اس طرح حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرا کر ہی لوگوں کو ہدایت دینا ہمارے پیشِ نظر ہوتا تو دنیا کی زندگی میں اتنے بڑے امتحان سے گزار کر تم کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی، ایسی ہدایت تو ہم پہلے ہی تم کو دے سکتے تھے۔ لیکن تمہارے لئے تو آغاز ہی سے ہماری اسکیم یہ نہ تھی ہم تو حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل اور حواس سے مخفی رکھ کر تمہارا امتحان لینا چاہتے تھے کہ تم براہ راست اُس کو بے نقاب دیکھنے کے بجائے کائنات میں اور خود اپنے نفس میں اس کی علامات دیکھ کر اپنی عقل سے اس کو پہچانتے ہو یا نہیں، ہم اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے اس حقیقت شناسی میں تمہاری جو مدد کرتے ہیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہو یا نہیں، اور حقیقت جان لینے کے بعد اپنے نفس پر اتنا قابو پاتے ہو یا نہیں کہ خواہشات اور اغراض کی بندگی سے آزاد ہو کر اس حقیقت کو مان جاؤ اور اس کے مطابق اپنا طرزِ عمل درست کر لو۔ اس امتحان میں تم ناکام ہو چکے ہو۔ اب دوبارہ اسی امتحان کا سلسلہ شروع کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ دوسرا امتحان اگر اس طرح لیا جائے

نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے بھر دوں گا[۲۴]۔ پس اب چکھو مزا اپنی اس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا[۲۵]، ہم نے بھی اب تمہیں فراموش کر دیا ہے۔ چکھو ہمیشگی کے عذاب کا مزا اپنے کرتوتوں کی پاداش میں"۔

ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں یہ آیات سنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور ذرہ برابر تکبر نہیں کرتے۔ سجدہ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب

کہ تمہیں وہ سب کچھ یاد ہو جو تم نے یہاں دیکھا اور سن لیا ہے تو یہ سرے سے کوئی امتحان ہی نہ ہوگا۔ اور اگر پہلے کی طرح تمہیں خالی الذہن کر کے اور حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل رکھ کر تمہیں پھر دنیا میں پیدا کر دیا جائے اور نئے سرے سے تمہارا اسی طرح امتحان لیا جائے جیسے پہلے لیا گیا تھا، تو نتیجہ پچھلے امتحان سے کچھ بھی مختلف نہ ہوگا۔ (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اوّل، صفحات ۱۶۰-۱۶۱-۵۲۵-۵۲۶-۵۳۲-۶۰۳-۶۰۴ - جلد دوم ص ۲۶۶-جلد سوم ص ۳۰۰)

[۲۴] اشارہ ہے اُس قول کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے وقت ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا تھا۔ سورۂ ص کے آخری رکوع میں اس وقت کا پورا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور نسل آدم کو بہکانے کے لیے قیامت تک کی مہلت مانگی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ، لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ "پس حق یہ ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں کہ میں جہنم کو بھر دوں گا تجھ سے اور ان لوگوں سے جو انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے"۔

اَجْمَعِيْن کا لفظ یہاں اس معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ تمام جن اور تمام انسان جہنم میں ڈال دیئے جائینگے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیاطین اور ان شیاطین کے پیرو انسان سب ایک ساتھ داخل جہنم ہونگے۔

[۲۵] یعنی دنیا کے عیش میں، گم ہو کر تم نے اس بات کو بالکل بھلا دیا کہ کبھی اپنے رب کے سامنے

کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں[۲۶]، اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے[۲۷]۔ بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو[۲۸]؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے[۲۹]۔ جو لوگ

بھی جانتا ہے۔

۲۶؎ یعنی راتوں کو دادِ عیش دیتے پھرنے کے بجائے وہ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا حال ان دنیا پرستوں کا سا نہیں ہے جنہیں دن کی محنتوں کی کلفت دور کرنے کے لیے راتوں کو ناچ گانے اور شراب نوشی اور کھیل تماشوں کی تفریحات درکار ہوتی ہیں۔ اس کے بجائے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ دن بھر اپنے فرائض انجام دے کر جب وہ فارغ ہوتے ہیں تو اپنے رب کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی یاد میں راتیں گزارتے ہیں۔ اس کے خوف سے کانپتے ہیں اور اسی سے اپنی ساری امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔

بستروں سے پیٹھیں الگ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ راتوں کو سوتے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ راتوں کا ایک حصہ خدا کی عبادت میں صرف کرتے ہیں۔

۲۷؎ بخاری، مسلم، ترمذی اور مسند احمد میں متعدد طریقوں سے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قال اللہ تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ فراہم کر رکھا ہے جسے نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کبھی کسی کان نے سنا، نہ کوئی انسان کبھی اس کا تصور کر سکا ہے"۔ یہی مضمون تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت سہل بن سعد ساعدی نے بھی حضورؐ سے روایت کیا ہے جسے مسلم، احمد، ابن جریر اور ترمذی نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۲۸؎ یہاں مومن اور فاسق کی دو متقابل اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ مومن سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبودِ واحد مان کر اس قانون کی اطاعت اختیار کرے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں

ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں[۳۰]،
ضیافت کے طور پر ان کے اعمال کے بدلے میں۔ اور وہ جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے ان
کی فرودگاہ دوزخ ہے۔ جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیئے جائینگے
اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اُسی آگ کے عذاب کا مزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔
اُس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا اِنہیں
چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں[۳۱]۔ اور اس سے بڑا ظالم

کے ذریعہ سے بیچا ہے۔ اس کے برعکس فاسق وہ ہے جو فسق (خروج از طاعت، یا بالفاظ دیگر بغاوت،
خود مختاری اور اطاعت غیر اللہ) کا رویہ اختیار کرے۔

۲۹؎ یعنی نہ دنیا میں ان کا طرزِ فکر و طرزِ حیات یکساں ہو سکتا ہے اور نہ آخرت میں ان کے ساتھ
خدا کا معاملہ یکساں ہو سکتا ہے۔

۳۰؎ یعنی وہ جنتیں محض ان کی سیر گاہیں نہیں ہوں گی بلکہ وہی ان کی قیام گاہیں بھی ہوں گی
جن میں وہ ہمیشہ رہینگے۔

۳۱؎ "عذابِ اکبر" سے مراد آخرت کا عذاب ہے جو کفر و فسق کی پاداش میں دیا جائے گا۔
اس کے مقابلہ میں "عذاب ادنیٰ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ تکلیفیں ہیں جو اسی دنیا
میں انسان کو پہنچتی ہیں۔ مثلاً افراد کی زندگی میں سخت بیماریاں، اپنے عزیز ترین لوگوں کی موت،
المناک حادثے، نقصانات، ناکامیاں وغیرہ اور اجتماعی زندگی میں طوفان، زلزلے، سیلاب،
وبائیں، قحط، فسادات، لڑائیاں اور دوسری بہت سی بلائیں جو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں انسانوں
کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ان آفات کے نازل کرنے کی مصلحت یہ بیان کی گئی ہے کہ عذاب
اکبر میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی لوگ ہوش میں آجائیں اور اس طرز فکر و عمل کو چھوڑ دیں جس کی
پاداش میں آخر کار انہیں وہ بڑا عذاب بھگتنا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے
کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بالکل بخیریت ہی نہیں رکھا ہے کہ پورے آرام و سکون سے زندگی

کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ ان سے منہ پھیر لے[۳۵]۔ ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے ۲ع

کی گاڑی چلتی رہے اور آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ اس سے بالا تر کوئی طاقت نہیں ہے جو اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ وقتاً فوقتاً افراد پر بھی اور قوموں اور ملکوں پر بھی ایسی آفات بھیجتا رہتا ہے جو اسے اپنی بے بسی کا اور اپنے سے بالا تر ایک ہمہ گیر سلطنت کی فرمانروائی کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ آفات ایک ایک شخص کو، ایک ایک گروہ کو اور ایک ایک قوم کو یہ یاد دلاتی ہیں کہ اوپر تمہاری قسمتوں کو کوئی اور کنٹرول کر رہا ہے سب کچھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دے دیا گیا ہے۔ اصل طاقت اسی کارفرما اقتدار کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی طرف سے جب کوئی آفت تمہارے اوپر آئے تو نہ تمہاری کوئی تدبیر اسے دفع کر سکتی ہے، اور نہ کسی جن، یا روح، یا دیوی اور دیوتا، یا نبی اور ولی سے مدد مانگ کر تم اس کو روک سکتے ہو۔ اس لحاظ سے یہ آفات محض آفات نہیں ہیں بلکہ خدا کی تنبیہات ہیں جو انسان کو حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ ان سے سبق لے کر دنیا ہی میں آدمی اپنا عقیدہ اور عمل ٹھیک کر لے تو آخرت میں خدا کا بڑا عذاب دیکھنے کی نوبت ہی کیوں آئے۔

[۳۵] "رب کی آیات" یعنی اس کی نشانیوں کے الفاظ بہت جامع ہیں جن کے اندر تمام اقسام کی نشانیاں آجاتی ہیں۔ قرآن مجید کے جملہ بیانات کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانیاں حسبِ ذیل چھ قسموں پر مشتمل ہیں:

(۱) وہ نشانیاں جو زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز میں اور کائنات کے مجموعی نظام میں پائی جاتی ہیں۔

(۲) وہ نشانیاں جو انسان کی اپنی پیدائش اور اس کی ساخت اور اس کے وجود میں پائی جاتی ہیں۔

(۳) وہ نشانیاں جو انسان کے وجدان میں، اس کے لاشعور اور تحت الشعور میں، اور اس کے

اس سے پہلے ہم موسیٰ کو کتاب دے چکے ہیں، لہٰذا اسی چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہیے[۲۳]

اخلاقی تصورات میں پائی جاتی ہیں۔

(۴) وہ نشانیاں جو انسانی تاریخ کے مسلسل تجربات میں پائی جاتی ہیں۔

(۵) وہ نشانیاں جو انسان پر آفات ارضی و سماوی کے نزول میں پائی جاتی ہیں۔

(۶) اور ان سب کے بعد وہ آیات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے بھیجیں تاکہ معقول طریقے سے انسان کو اُنہی حقائق سے آگاہ کیا جائے جن کی طرف اوپر کی تمام نشانیاں اشارہ کر رہی ہیں۔

یہ ساری نشانیاں پوری ہم آہنگی اور بلند آہنگی کے ساتھ انسان کو یہ بتا رہی ہیں کہ تو بے خدا نہیں ہے، نہ بہت سے خداؤں کا بندہ ہے، بلکہ تیرا خدا صرف ایک ہی خدا ہے جس کی عبادت واطاعت کے سوا تیرے لیے کوئی دوسرا راستہ صحیح نہیں ہے۔ تو اس دنیا میں آزاد و خود مختار اور غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ تجھے اپنا کارنامۂ حیات ختم کرنے کے بعد اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر جواب دہی کرنی ہے اور اپنے عمل کے لحاظ سے جزا اور سزا پانی ہے پس تیری اپنی خیر اسی میں ہے کہ تیرے خدا نے تیری رہنمائی کے لیے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے اس کی پیروی کر اور خود مختاری کی روش سے باز آجا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس انسان کو اتنے مختلف طریقوں سے سمجھایا گیا ہو، جس کی فہمائش کے لیے طرح طرح کی اتنی بے شمار نشانیاں فراہم کی گئی ہوں، اور جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں، سُننے کے لیے کان اور سوچنے سمجھنے کے لیے دل کی نعمتیں بھی دی گئی ہوں، وہ اگر ان ساری نشانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، سمجھانے والوں کی تذکیر و نصیحت کے لیے بھی اپنے کان بند کر لیتا ہے، اور اپنے دل و دماغ سے بھی اوندھے فلسفے ہی گھڑنے کا کام لیتا ہے، اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ پھر اسی کا مستحق ہے کہ دنیا میں اپنے امتحان کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو تو بغاوت کی بھرپور سزا پائے۔

۲۳؎ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضور کی

اُس کتاب کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا،[۴۳] اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم

رسالت میں، اور آپ کے اوپر کتاب الٰہی کے نازل ہونے میں شک کر رہے تھے۔ یہاں سے کلام کا رُخ اُسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو آغازِ سورہ (آیات نمبر ۲، ۳) میں بیان ہُوا تھا۔ کفارِ مکہ کہہ رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر خدا کی طرف سے کوئی کتاب نہیں آئی ہے، انہوں نے اسے خود گھڑ لیا ہے اور دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے۔ اس کا ایک جواب ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ اب اس کا دوسرا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات جو فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اے نبی، یہ نادان لوگ تم پر کتاب الٰہی کے نازل ہونے کو اپنے نزدیک بعید از امکان سمجھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر دوسرا شخص بھی اگر اس کا انکار نہ کرے تو کم از کم اس کے متعلق شک ہی میں پڑ جائے۔ لیکن ایک بندے پر خدا کی طرف سے کتاب نازل ہونا ایک نرالا واقعہ تو نہیں ہے جو انسانی تاریخ میں آج پہلی مرتبہ ہی پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے متعدد انبیاء پر کتابیں نازل ہو چکی ہیں، جن میں سے مشہور ترین کتاب وہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ لہٰذا اسی نوعیت کی ایک چیز آج تمہیں دی گئی ہے تو آخر اس میں انوکھی بات کیا ہے جس پر خواہ مخواہ شک کیا جائے۔

۴۳۔ یعنی وہ کتاب بنی اسرائیل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنائی گئی تھی، اور یہ کتاب اسی طرح تمہاری رہنمائی کے لیے بھیجی گئی ہے، جیسا کہ آیت نمبر ۳ میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس ارشاد کی پوری معنویت اس کے تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے، اور کفارِ مکہ بھی اس سے ناواقف نہ تھے کہ بنی اسرائیل کئی صدی تک مصر میں انتہائی ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، ان کے ذریعہ سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی قوم ہدایت پاکر دنیا میں ایک نامور قوم

سے رہنمائی کرتے تھے۔[۳۵]

کیا ان لوگوں کو (ان تاریخی واقعات میں) کوئی ہدایت نہیں ملی کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں[۳۶]؟ اس میں بڑی

بن گئی۔ اس تاریخ کی طرف اشارہ کر کے اہلِ عرب سے فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے وہ کتاب بھیجی گئی تھی، اسی طرح تمہاری ہدایت کے لیے یہ کتاب بھیجی گئی ہے۔

۳۵۔ یعنی بنی اسرائیل کو اس کتاب نے جو کچھ بنایا اور جن مدارج پر ان کو پہنچایا، وہ محض ان کے درمیان کتاب کے آجانے کا کرشمہ نہ تھا گویا یہ کوئی تعویذ ہو جو باندھ کر اس قوم کے گلے میں لٹکا دیا گیا ہو اور اس کے لٹکتے ہی قوم نے بامِ عروج پر چڑھنا شروع کر دیا ہو، بلکہ یہ ساری کرامت اُس یقین کی تھی جو وہ اللہ کی آیات پر لائے، اور اُس صبر اور ثابت قدمی کی تھی جو انہوں نے احکامِ الٰہی کی پیروی میں دکھائی۔ خود بنی اسرائیل کے اندر بھی پیشوائی انہی کو نصیب ہوئی جو ان میں سے کتاب اللہ کے سچے مومن تھے اور دنیوی فائدوں اور لذتوں کی طمع میں پھسل جانے والے نہ تھے۔ انہوں نے جب حق پرستی میں ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ہر نقصان اور ہر تکلیف کو برداشت کیا، اور اپنے نفس کی شہوات سے لے کر باہر کے اعدائے دین تک ہر ایک کے خلاف مجاہدہ کا حق ادا کر دیا تب ہی وہ دنیا کے امام بنے۔ اس سے مقصود کفارِ عرب کو متنبہ کرنا تھا کہ جس طرح خدا کی کتاب کے نزول نے بنی اسرائیل کے اندر قسمتوں کے فیصلے کیے تھے، اسی طرح اب اس کتاب کا نزول تمہارے درمیان بھی قسمتوں کا فیصلہ کر دے گا۔ اب وہی لوگ امام بنیں گے جو اس کو مان کر صبر و ثبات کے ساتھ حق کی پیروی کریں گے۔ اس سے منہ موڑنے والوں کی تقدیر گردش میں آچکی ہے۔

۳۶۔ یعنی کیا تاریخ کے اس مسلسل تجربے سے انہوں نے کوئی سبق نہیں لیا کہ جس قوم میں بھی خدا کا رسول آیا ہے اس کی قسمت کا فیصلہ اُس رویّے کے ساتھ معلّق ہو گیا ہے جو اپنے رسول کے معاملہ میں اس نے اختیار کیا۔ رسول کو جھٹلا دینے کے بعد پھر کوئی قوم بچ نہیں سکی ہے۔ اس میں سے

نشانیاں ہیں، کیا یہ سنتے نہیں ہیں؟ اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب وگیاہ زمین کی طرف پانی بہا لاتے ہیں اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اُگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارہ ملتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں؟ تو کیا انہیں کچھ نہیں سوجھتا؟[۳۷] یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ فیصلہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو؟[۳۸]" ان سے کہو "فیصلے کے دن ایمان لانا اُن لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہوگا جنہوں نے کفر کیا ہے اور نہ پھر اُن کو کوئی مہلت ہی ملے گی[۳۹]"۔ اچھا، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔ ۳ع

بچے ہیں تو صرف وہی لوگ جو اس پر ایمان لائے۔ انکار کر دینے والے ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن کر رہ گئے۔

۳۷۔ سیاق و سباق کو نگاہ میں رکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں یہ ذکر حیات بعد الموت پر استدلال کرنے کے لیے نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن میں بالعموم ہوتا ہے، بلکہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بات ایک اور ہی مقصد کے لیے فرمائی گئی ہے۔ اس میں دراصل ایک لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح ایک بنجر پڑی ہوئی زمین کو دیکھ کر آدمی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ یہ بھی کبھی لہلہاتی کشت زار بن جائے گی، مگر خدا کی بھیجی ہوئی برسات کا ایک ہی ریلا اس کا رنگ بدل دیتا ہے، اسی طرح یہ دعوتِ اسلام بھی اس وقت تم کو ایک نہ چلنے والی چیز نظر آتی ہے لیکن خدا کی قدرت کا ایک ہی کرشمہ اس کو وہ فروغ دیگا کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔

۳۸۔ یعنی تم جو کہتے ہو کہ آخر کار اللہ کی مدد آئے گی اور ہمیں جھٹلانے والوں پر اُس کا غضب ٹوٹ پڑے گا، تو بتاؤ وہ وقت کب آئے گا؟ کب ہمارا تمہارا فیصلہ ہوگا؟

۳۹۔ یعنی یہ کونسی ایسی چیز ہے جس کے لیے تم بے چین ہوتے ہو۔ خدا کا عذاب آگیا تو پھر سنبھلنے کا موقع بھی تم کو نصیب نہ ہوگا۔ اس مہلت کو غنیمت جانو جو عذاب آنے سے پہلے تم کو ملی ہوئی ہے۔ عذاب سامنے دیکھ کر ایمان لاؤ گے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔

مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود مذہبی مناصب

اوّلین تجربہ — خلافت عباسیہ میں

از جناب نعیم صدیقی صاحب

(۳)

دورِ عباسیہ میں قاضی القضاۃ کے ہاتھ میں صرف دیوانی اور فوجداری عدالتیں ہی نہ تھیں، بلکہ محکمۂ اوقاف، محکمۂ وصایا، پولیس، شکایات، قصاص، احتساب، دار الضرب (ٹکسال) اور بیت المال کے شعبے بھی آہستہ آہستہ اس کے تحت آگئے۔ [1]

بعد کے ادوار اور دوسری سلطنتوں میں بھی عدلیہ کے ہاتھ میں فصلِ خصومات کے علاوہ مختلف ذمہ داریاں دی جاتی رہیں۔ مثلاً آلِ بویہ کے قاضی القضاۃ، ابو احمد بن حسین بن موسیٰ علوی کے ذمے معاملات، قضا کے علاوہ حج، مظالم، نقابت طالبین کے فرائض بھی تھے [2]۔ السبکی کے بقول قاضی تاج الدین کے گرد ۱۵ قسم کے مناصب جلیلہ جمع تھے جس میں قضا کے علاوہ قیدیوں اور قید خانوں کی دیکھ بھال، تدریس، خطابت اور امامتِ جامع وغیرہ بھی شامل تھے [3]۔ مصر کی فاطمی حکومت کے عہد میں داعی الدعاۃ (جو قاضی القضاۃ بھی تھا) کے فرائض میں قضاء کے علاوہ متعدد ذمہ داریاں داخل تھیں۔ وہ قانون اور مذہبی عقائد کے متعلق استفسارات کے جواب دیتا تھا، قرآن کے مشکل مقامات کی تشریح کرتا تھا، "دار العلم" (جس میں یونیورسٹی، لائبریری، ریکارڈ آفس اور دار الامناء کے شعبے جمع تھے) کی صدارت کرتا تھا۔ ایوان کبیر میں اہلِ ایمان مردوں کی مجلس کے

---

[1] مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر حسن ابراہیم حسن - ص ۳۱۷

[2] تاریخ الخلفاء - علامہ سیوطی ص ۴۷۲ ۔ مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص ۳۲۲

[3] تاریخ القضاء فی الاسلام - از محمد بن محمود بن عرنوس مصری - ص ۱۰۶ -

درمیان مسند تبلیغ پر بیٹھنا اور عورتوں کی مجلس الداعی میں شمولیت کرتا[۱]۔ قاضی ابوالعباس (استی) کو فاطمی دور میں عدالت کے علاوہ دارالضرب کی نگرانی، معبادات واذان کی دیکھ بھال، معاملات میراث کی سربراہی، اور نماز اور جامع مسجد کے انتظامات تفویض کئے گئے تھے[۲]۔ ایران کے صفوی دور میں اگرچہ قضاء کا دائرۂ کار محدود کر دیا گیا تھا، تاہم عدالتی ذمہ داریوں کے علاوہ قرض، میراث، معاملات، بیع وشریٰ اور نکاح وطلاق کے معاملات قاضیوں ہی کے ہاتھ میں تھے[۳]۔ مصری قضاۃ کے سپرد رویت ہلال کا فریضہ بھی کیا گیا[۴]۔

۲:- قاضی القضاۃ کا منصب قائم ہونے سے ایک عظیم تبدیلی محکمۂ عدلیہ میں یہ واقع ہوئی کہ اس سے پہلے قاضیوں کے تقرر و برطرفی کا اختیار سلطان کے تحت گورنروں کو حاصل تھا۔ لیکن اب یہ اختیار قاضی القضاۃ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ قاضی کی تقرری یا برطرفی، ان کے کام کی نگرانی اور عوام سے ان کے تعلقات کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داریاں قاضی القضاۃ کے تحت چلی گئیں[۵]۔ اس پہلو سے گویا قاضی القضاۃ کا مرتبہ موجودہ دور کے چیف جسٹس کا سا تھا۔ مثلاً امام ابویوسف کا مرتبہ تھا کہ عراق، خراسان، شام اور مصر کے شہروں میں امام کے مشورے کے بغیر کسی کا تقرر نہیں ہو سکتا تھا[۶]۔ یہی حیثیت اندلس میں بہ عہد الحکم المرتضیٰ (۱۸۰ھ) یحییٰ بن یحییٰ کثیر اندلسی کو حاصل تھی، اگرچہ انہوں نے منصب

۱۔ خطط مقریزی۔ ص ۳۹۱، ۴۵۸۔ THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM - BY: P ۳۸۸

۲۔ مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) - از پروفیسر حسن ابراہیم حسن۔ ص ۲۲۰۔

۳۔ THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM ——— BY: P: ۲۶۴ — ۲۶۵

۴۔ تاریخ القضاء فی الاسلام —— از محمد بن محمود بن عرنوس مصری۔ ص ۱۱۴۔

۵۔ تاریخ القضاء فی الاسلام - از محمد بن محمود بن عرنوس مصری۔ ص ۹۵، ۹۶ ۔ P: ۳۲۲

HISTORY OF ARABS. —— BY HITLI.

۶۔ تاریخ القضاء فی الاسلام - از محمد بن محمود بن عرنوس مصری۔ ص ۹۷ - ۱۲۲۔

خطط مقریزی ج ۴۔ جواہر ج ۲ ص ۲۲۱۔

قضا قبول نہیں کیا اور اعزازی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ان کی مرضی ہی سے اندلس کے عمال کا تقرر ہوتا تھا۔ ان کو "قاضیِ اندلس" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا[1]۔

۳:۔ قاضی القضاۃ صرف قاضیِ اعلیٰ، اور چیف جسٹس ہی نہیں تھا بلکہ وہ وزیر انصاف کا مقام بھی رکھتا تھا۔ چند رائیں ملاحظہ ہوں:۔

"محکمۂ عدلیہ کی مطلق العنان وزارت قاضی ابویوسف کے حوالے کی گئی تھی[2]"۔۔۔ "بالآخر حکومت نے اپنے شعبۂ عدل و انصاف کو بالکلیہ اہلِ علم کے سپرد کر دیا[3]"

۔۔۔ "عباسیوں نے اپنے عہد میں قاضی القضاۃ کا منصب قائم کیا جو عہد جدید کے وزیرِ عدل و انصاف کے ہم پلہ تھا[4]۔" "قاضی یحییٰ بن اکثم مامون کے زمانے میں" اس کے قاضی القضاۃ اور وزیر تھے[5]۔" ۔۔۔ "سلطنتِ مامون میں یحییٰ بن اکثم کو وہی رتبہ حاصل ہوا جو ہارون الرشید کے دور میں امام ابویوسف کو حاصل تھا۔ بلکہ یحییٰ رتبۂ وزارت پر فائز ہوئے جیسے کہ اکثر مؤرخین نے بیان کیا ہے[6]۔"

۔۔۔ "اسی طرح احمد بن ابی دؤاد کے متعلق کثیر روایات ہیں۔ مثلاً "معتصم اس کے مشورے کے بغیر کوئی اقدام نہ کرتا تھا[7]۔"

---

[1] تاریخ القضاء فی الاسلام ۔ از محمد بن محمود بن عرنوس مصری ۔ ص ۹۷ ۔

[2] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ۔ از مولینا مناظر احسن گیلانی ۔ ص (بحوالہ مقریزی و ابن عبدالبر)

• مناقب موفق ج ۲، ص ۲۲۵ ۔ •

[3] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ۔۔۔ از مولینا مناظر احسن گیلانی ص ۴۸۴ ۔

[4] مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ) ۔۔۔ از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص ۳۱۷ ۔

[5] تاریخ القضاء فی الاسلام ۔۔۔ از محمد بن محمود بن عرنوس ۔ ص ۹۸ ۔

[6] " " " " " " ص ۱۳۲

[7] تاریخ طبری ۔ ج ۷، واقعات ۲۱۸ھ، ص ۲۱۰ • تاریخ القضاء فی الاسلام ۔۔۔ از محمد بن محمود بن عرنوس ۔ ص ۱۸۳، ۱۸۴ ۔

عملاً معاملہ وزارتِ انصاف ہی تک محدود نہ رہا بلکہ جس قاضی القضاۃ سے فرماں رواؤں کو دینی رہنمائی اور قانونی مشورہ بار بار حاصل کرنا ہوتا تھا اور جسے دربار میں ایک مستقل مسندِ اعزاز حاصل تھی، وہ تمام معاملاتِ سلطنت میں مشیر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مثلاً امام ابویوسف کا مقام یہ تھا کہ "فقد کان مستشار دارالخلافة" وہ مرکزِ سلطنت کے مشیر تھے[1]۔ متعدد واقعات ہمارے سامنے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قاضی القضاۃ کا دخل صرف عدلیہ کے معاملات تک ہی محدود نہ تھا۔ قاضی ابودؤاد تو بادشاہت کی ناک کے بال بن گئے تھے۔ ان کا معاملہ صرف قضاء کے دائرے تک محدود نہ تھا بلکہ وہ معتصم کو بیشتر معاملات میں مشورہ دیتے[2]۔ جعفر المتوکل کی نامزدگی اور بیعت میں جس طرح ابودؤاد پیش پیش تھے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں[3]۔

ان اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ منصب کتنا بڑا منصب تھا۔ اس منصب جلیلہ کی تشکیل اور اسلامی نظامِ قانون و عدالت کی مستحکم تنظیم اقتدار کو اپنی شانِ مطلق العنانی کے باوجود اس لیے کرنی پڑی کہ معاشرہ کی اسلامی حس کی تسکین ہو سکے۔ جسے حق پسند علماء و فقہا کا گروہ بیدار رکھنے کے لیے برابر کام کر رہا تھا اور اس کے دباؤ سے حکومت کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔

مگر یہ نہ بھولئے کہ یہ منصب بہرحال محدود منصب تھا اور مطلق العنانی کے بحرِ مواج کے درمیان اس کی حیثیت ایک چھوٹے سے جزیرے کی تھی۔ مردانِ حق آئے تو یہ جزیرہ کسی قدر پھیلاؤ اختیار کرتا اور بندگانِ مفاد آجاتے تو یہ سکڑ جاتا اور موجیں اس کے اوپر سے گزرنے لگتیں۔

اربابِ اخلاص باہر رہ کر بھی اور مناصب پر آکر بھی اقتدار پر برابر دباؤ ڈالتے رہے اور اسی کے نتیجے میں عدلیہ کو وسیع تر اختیارات اور داخلی آزادی حاصل ہوئی۔ لیکن اقتدار بھی موقع بہ موقع عدلیہ کی قوت کو گھٹانے کے لیے مختلف تدبیریں کرتا رہا جس میں سے موثر ترین یہ اقدام تھا

[1] تاریخ القضاء فی الاسلام ۔ ا محمد بن محمود بن عرنوس ۔ ص ۱۲۲ ۔

[2] " " " " " " ص ۱۸۶

[3] تاریخ طبری ۔ ج ۷ ، ذکر خلافت جعفر المتوکل ۔ ص ۳۴۱ ، ۳۴۲ ۔

کہ قانون کی تقسیم کر دی گئی اور سیاسی و دنیوی معاملات اسلامی عدلیہ کے قاضیوں کے ہاتھ سے نکال لیے گئے، یہاں تک بالآخر ان کے پاس صرف نکاح و طلاق اور وراثت و وصایا جیسے معاملات رہ گئے جنہیں آج کل کی اصطلاح میں پرسنل لاء کے زیرِ عنوان رکھا جاتا ہے۔

علماء و فقہاء اور مناصبِ قضاء موروثی بادشاہت کے مطلق العنان اقتدار میں دو ہی گوشے ایسے تھے جن کی وجہ سے معاشرہ کی اسلامیت برقرار تھی۔ ایک تو مساجد میں اقامتِ صلوٰۃ، جمعہ وعیدین، حج و زکوٰۃ اور مواعظ و دروس کا سلسلہ اور دوسرا اسلامی عدلیہ۔ اجتماعی ادارے کی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت مؤخر الذکر کو حاصل تھی۔ انہی چیزوں کے بل پر حکومت کی اسلامیت کا بھرم قائم تھا۔ خصوصاً عباسی حکمران اس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ صاف تر لفظوں میں "بات یہ تھی کہ عباسی فرمانروا اپنے تمام اعمال و افعال کو مذہبی رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے[1]" خلفائے عباسیہ کا حال یہ تھا کہ "فقد صبغوا دینیۃ ظاھرۃ ونظر الیھم کانھم حماۃ الاسلام" یعنی وہ ظاہری مذہبیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ان کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ گویا وہ بڑے حامیانِ اسلام ہیں[2]۔ اسی جذبے سے وہ وقتاً فوقتاً تبلیغ اسلام اور ملاحدہ و زنادقہ کی سرکوبی کی مہمات چلاتے تھے جن کا عملی نتیجہ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کی شکل میں نکلتا رہا[3]۔ اسی بنا پر سیاسی قوت کھو دینے پر بھی ان کا روحانی اثر قائم رہا[4]۔ ایک مثال لیجیے: سلطان عضد الدولہ کے دور میں (۳۶۷ھ تا ۳۷۲ھ) اگرچہ سارا اقتدار سلطان کے ہاتھ میں تھا اور طائع باللہ کی خلافت بالکل برائے نام تھی۔ مگر عوام پر اس کی اسلامیت کا سکہ چل رہا تھا[5]۔

۱؎ مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ) — از پروفیسر حسن ابراہیم حسن۔ ص ۱۵ ۳

۲؎ ضحی الاسلام — از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱، ص ۲۷۴۔

۳؎ " " " " " "

۴؎ " " " " " "

۵؎ مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ) — از پروفیسر حسن ابراہیم حسن۔ ص ۹۰۔

حکومت کے دستور یا سیاسی ہیں تو مصلحت اور حالات کے تقاضوں کے تحت تبدیلی کر لی گئی تھی مگر اسلامی قانون کا قلادہ اتار نے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ اسلامی قانون کے ترک کے معنی اسلام سے کلی بغاوت سے کم نہ ہوتے۔ اس بغاوت کے لیے اس عہد کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی تیار نہ ہوتا، کجاکہ فرماں روا۔ درحقیقت ارباب حکومت اسلام کی بہت سی حدود توڑتے ضرور تھے مگر کوئی بھی بالارادہ مکمل بغاوت کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور وہ لوگ اپنے مسلمان ہونے کی نفی کسی حال میں نہ کر سکتے تھے۔ پھر معاشرہ اسلامی قانون ہی کے بندھن سے بندھا ہوا تھا۔ اس بندھن کو کھولنا تو درکنار، ذرا سا ڈھیلا کر دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ ساری ترتیب ختم ہو جاتی اور پھر انتشار کے عالم میں خود حکومت کا تخت کسی طرح ٹک ہی نہ سکتا۔ لیکن اسلامی عدلیہ کے ذریعے قانون شریعت کا اجراء و نفاذ بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ مستند اور عوام کے معتمد علیہ علماء و فقہا اس کے مناصب پر آئیں۔ قاضی عابس جیسے لوگ عدلیہ کو چلاتے تو نہ صرف قانون شریعت مذاق بن جاتا بلکہ عدلیہ کی ساکھ ہی یکسر ماری جاتی اور اس صورت میں حکمرانوں کے متعلق بھی یہ تصور عام ہو جاتا کہ یہ لوگ نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں اسلامی قانون کو کھلونا بنا کر بالآخر اس کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔ جس حکومت کو کسی شعبے میں اہلِ افراد حاصل نہ ہو سکیں اور کام نااہلوں کو سونپا جائے، عوام کی نگاہوں میں اس کا کوئی وزن نہیں رہتا۔ سو پہلے اموی حکمرانوں نے اور ان کے بعد عباسی فرمانرواؤں نے اس امر کے لیے بڑی کوششیں کیں کہ مستند اہلِ علم، شہرت یافتہ اور باوثر فقہا اور جمہور کی فکری قیادت کرنے والے ائمہ قضاء کے مناصب قبول کریں۔

سب سے پہلے اس معاملے میں یزید کے دور میں حکومت کی توجہ منعطف ہوئی۔ یزید نے اپنے دامن پر امام حسینؓ کی تحریک کو کچل کر جو امٹ دھبہ لگا لیا تھا، اس کی وجہ سے اقتدار اور علم کے درمیان خلیج حائل ہو گئی تھی۔ حکومت علمائے حق کے تعاون سے محروم ہو گئی۔ ممتاز اہلِ علم کا حکومت سے باہر رہنا جہاں اسے عوام کی نگاہوں میں بے وزن بناتا تھا وہاں یہ

اندیشہ بھی تھا کہ علماء صفِ اختلاف میں رہ کر سیاسی خطرہ بنتے رہیں گے۔ پس جب کوفہ جیسے سازشی مرکز میں ابن ہبیرہ کو گورنر مقرر کیا گیا تو اسی وقت یہ پالیسی طے پائی کہ حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے دینی شخصیتوں کو اس میں شریک کیا جائے۔ اسی پالیسی کے تحت فقہائے عراق میں سے قاضی ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ داؤد بن ہند وغیرہم کو قضا کے عہدے سونپے گئے، اور اسی پالیسی کے تحت حضرت امام ابو حنیفہ کو ہاتھ میں لینے کے لیے بڑے جتن کیے گئے، حتیٰ کہ کوڑا حرکت میں آ گیا۔[1] یہی پالیسی عباسی دور میں بھی برقرار رہی۔ عباسی دور میں اس پالیسی کا دوسرا جزو یہ بھی اختیار کر لیا گیا کہ جو دینی شخصیتیں کسی طرح بھی مناصب کے دام میں نہ آئیں، ان کو عطایا سے نوازنے کی کوششیں کی جاتیں۔ بلکہ بسا اوقات ایک ہاتھ سے کوڑے برسانے کے بعد دوسرے ہاتھ سے اشرفیاں برسائی جاتیں۔ تیغِ جفا کے زخم لگا کر پھر خود ہی سیم و زر کا مرہم عطا رکھا جاتا۔ عباسیوں نے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے انقلابی رجحانات کا بچشم خود مشاہدہ کر لیا تھا، اور بڑے بھاری سیاسی اندیشے ان کے سامنے تھے۔ اس لیے وہ علماء کو مناصب کے سنہری پنجرے میں لینے کے لیے بہت سرگرم رہے۔ ان کے سامنے حسبِ ذیل مقاصد تھے:۔

۱۔ عدلیہ اور قانونی نظام بخیر و خوبی چلتا رہے اور اس کا رنگِ مذہبیت عوام کی نگاہوں میں اعتماد حاصل کر سکے۔

۲۔ ممتاز اور مقبولِ عام علماء کو حکومت کی صفوں میں پا کر جمہور مطمئن رہیں کہ سب اچھا ہے۔

۳۔ علماء دائرۂ اقتدار سے باہر رہ کر اپنے اثر کو سیاسی انقلابات کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔

۴۔ ملازمتوں اور دنیوی اعزازات و مفاد کے فولاد سے ان میں یہ سکت نہ رہنے دیں کہ وہ حکومت کے لیے حزب اختلاف ثابت ہوں۔

لیکن علمائے حق دلِ بیدار اور چشمِ بینا کی دولت سے بہرہ مند تھے، وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان کے سامنے کیسا دام بچھ رہا ہے اور اس دام میں کیا دانہ گرایا جا رہا ہے۔ وہ اقتدار کے مقابلے

[1] عقود الجمان باب ۲۱۔

پر اپنے آزادانہ موقف کو بچانے کے لیے مضبوطی سے کھڑے ہو گئے۔ اور نہ صرف انہوں نے فقر و فاقہ کی بھٹیوں میں تپنا اور دنیوی اعزازات، معاشرتی ترقیات اور معیشت کے کھلم کھلا لٹتے ہوئے خوانِ یغما سے محروم رہنا اپنے لیے پسند کیا، بلکہ قید و بند اور تازیانوں کو لبیک کہا۔ ائمۂ اکابر ہی نہیں اکثر فقہا اور علمائے قانون نے مناصب سے گریز کی راہ اختیار کی، بلکہ ان کے طفیل ملت کے علماء کی مستقل روایت یہ بن گئی کہ مطلق العنان اقتدار کے تحت وہ سرکاری مناصب پر جانے سے باز رہیں۔ اور ہمیشہ ایسے ہی عزیمت مند رجال کو جمہور مسلمانوں کی نگاہوں میں قدر و قیمت حاصل ہوئی۔ علماء کی اس پالیسی کا عظیم ترین فائدہ یہ ہُوا کہ سلطنتِ علم سیاسی فرمانرواؤں کے تصرف سے آزاد رہی اور قرآن کی ہدایت اور نبیؐ کی حکمت بے آمیز شکل میں آگے منتقل ہو سکی۔ ورنہ اگر خدانخواستہ علماء نے علمِ دین کو اقتدار کے خراد پر چڑھ جانے دیا ہوتا تو نجانے چھل چھلا کر اس کی کیا گت بنتی اور آج اسکی اصل حقیقت کو پانا ممکن بھی ہوتا یا نہیں۔ دوسری ساری آزادیاں لٹ جانے پر ان حضرات کے دم سے "آزادیٔ علم" محفوظ رہ گئی۔ سرکاری مناصب اور عطایا سے پرہیز کے وجوہ اربابِ حق کے سامنے حسبِ ذیل تھے:۔

۱۔ علمائے حق کو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے جو اساسی جذبہ ملا تھا وہ یہ تھا کہ علمِ دین دنیا کمانے اور دنیا بنانے کا آلہ نہیں ہے۔ راست باز ائمہ و فقہا میں ہمیشہ یہ روح کارفرما رہی کہ وہ علم کی مسند پر ورثائے انبیاء بن کر بیٹھیں تو دنیوی مفاد کی ہوس سے پاک ہو کر بیٹھیں ان کے سامنے حضورؐ کے بہت سے ارشادات تھے جن میں سے چند یہ ہیں:۔

حضورؐ نے فرمایا:۔

"علم (علمِ دین) جس کے ذریعے اللہ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے، اسے اگر کسی شخص نے مجرد اس مقصد سے سیکھا کہ اس کے ذریعے دنیوی مفاد حاصل کرے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔"[1]

---

[1] روایت ابو ہریرہؓ ــــــ (احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ)

حضورؐ نے فرمایا :-

"وہ شخص کہ جسکو اس حال میں موت آئے کہ وہ یہ مقصد سامنے رکھ کر حصولِ علم میں لگا ہو کہ اس کے ذریعے احیائے اسلام کرے گا، جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا [1]"

حضورؐ نے فرمایا :-

"اس علم (یعنی علم دین) کو ہر نسل کے کچھ راست باز لوگ حاصل کریں گے اور اس کو غالیوں کی تحریفات، باطل پسندوں کی افترا پردازیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے چھانٹ کر الگ کریں گے [2]"

یہ تھا علمائے حق کا اصولی نقطۂ نظر جس کی وجہ سے انہوں نے علم کی آزاد سلطنت بالکل الگ قائم کی اور بڑے سے بڑے دنیوی مفاد نے اگر ان کے دروازے پر آکر بھی دستک دی تو ان کے عِنا نے اسے دھتکار دیا۔ ان کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ دین کی عظیم ترین خدمت میں حرص کی آلائش آنے دیں۔

۲ :- دوسری چیز جو ان کے سینوں میں جاگزیں تھی وہ منصب طلبی کے خلاف ایک اصولی جذبۂ اجتناب تھا۔ اسلام کا نظام چلانے کے لیے اگرچہ مناصب کا وجود بھی ناگزیر ہے اور ان مناصب پر بہترین افراد کا آنا بھی ضروری ہے اور اس معاملے میں حد سے بڑھا ہوا سہل انگاری کا تقشف بھی ناپسندیدہ ہے، لیکن سچے اسلامی معاشرہ میں مناصب کی ہوس کا پایا جانا اور ان کو مقصود بنا کر ان کی طرف لپکنا اور مختلف لوگوں کا ان کے لیے مسابقت کرنا بھی روا نہیں ہے۔ افراد کا کام نہیں کہ وہ مناصب کے درپے ہوں، بلکہ چاہئے کہ مناصب اپنے لیے موزوں افراد کے پیچھے جا کر دامن گیر ہوں کہ تمہاری خدمات کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں حضورؐ کی جو تعلیم

---

[1] روایت حسن ——— (دارمی)

[2] روایت ابراہیم بن عبدالرحمٰن ——— (بیہقی)

علمائے حق کے سامنے تھی اس میں سے چند کلمات مندرجہ ذیل ہیں :-

حضورؐ نے فرمایا :-

" اے قُدیم (مخاطب راوی حدیث حضرت مقدام بن معدیکرب سے ہے) اگر تمہیں اس حال میں موت آئے کہ تم نہ تو امیر بنے ہو، نہ محرّر (سیکرٹری) اور نہ سرپنچ (چوہدری یا نمبردار وغیرہ) تو تم فلاح پا گئے[1]"

حضورؐ نے فرمایا :-

" دس آدمیوں پر امیر (حاکم یا سردار) بننے والا کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو قیامت کے دن اس حال میں نہ لایا جائے کہ اس کے گلے میں طوق پڑا ہو — یہاں تک کہ یا تو اس کا عدل اس طوق سے نجات دلائے یا اس کا ظلم اسے ہلاکت میں ڈال دے[2]"

قضاء کے مناصب کے متعلق خصوصیت سے جو انتباہ دیئے گئے تھے وہ بھی اہلِ علم کے سامنے تھے ملاحظہ ہوں :-

حضورؐ نے فرمایا :-

" جس شخص کو لوگوں کے درمیان قاضی مقرر کیا گیا، وہ گویا چھری کے بغیر ذبح ہوا[3]"

حضورؐ نے فرمایا :-

" قاضی العدل کو تم قیامت کے دن یہ حسرت کرتے ہوئے دیکھو گے کہ کاش کہ اس نے دو شخصوں کے درمیان ایک کھجور کی نزاع کا فیصلہ بھی قطعاً نہ کیا ہوتا[4]"

۳ :- تیسرا معاملہ علمائے حق کے سامنے فاسد حکومت اور فاسق حکمرانوں سے تعاون کرنے

---

[1] روایت مقدام بن معدیکرب —— (ابوداؤد)

[2] روایت ابوہریرہؓ —— (دارمی)

[3] " " —— (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

[4] روایت ام المومنین عائشہؓ —— (احمد)

کا تھا۔ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتباہی ارشادات بہت ہی واضح اور سخت تھے۔ مثلاً :۔

—حضورؐ نے (ان امرا، کا ذکر کرتے ہوئے جو بعد میں آئیں گے اور اچھے اور برے کام ملے جلے کریں گے) فرمایا :۔

"جس نے ان لوگوں سے بیزاری کا رویہ اختیار کیا وہ نجات پا گیا، جس نے ان کو ٹوکا وہ سلامت رہا، لیکن جو ان سے راضی ہوا اور ان کے پیچھے چل پڑا .... (وہ نجات اور سلامتی سے محروم رہا) [۱]"

—حضورؐ نے (بعد میں آنے والے ان ناخلف لوگوں کے متعلق جو کہیں گے وہ کچھ جس پر عمل نہ کریں گے، اور عمل کریں گے وہ کچھ جس کا ان کو حکم نہیں دیا گیا) فرمایا :۔

"جس نے ان کے خلاف ہاتھ سے جہاد کیا، وہ صاحبِ ایمان ہے، اور (دوسرے درجے پر) جس نے ان کے خلاف زبان سے جہاد کیا وہ صاحبِ ایمان ہے، اور (تیسرے درجے پر) جس نے ان کے خلاف دل سے جہاد کیا وہ صاحبِ ایمان ہے۔ اس سے نیچے اتر کر رتی بھر ایمان بھی نہیں رہ سکتا [۲]"

—حضورؐ نے فرمایا :۔

"جو شخص کسی ظالم قوت یا شخص یا ادارے کے ساتھ معاون بن کر چلا تا کہ اس کے ہاتھ مضبوط کرے، درانحالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے باہر ہو گیا [۳]"

—حضورؐ نے فرمایا :۔

جس شخص نے کسی صاحبِ بدعت (یعنی دین حق اور نظامِ اسلامی میں نئے نئے شگوفے چھوڑنے والے) کی عزت افزائی کی تو اس نے اسلام کی عمارت ڈھا دینے میں تعاون کیا [۴]

[۱] روایت ام المومنین ام سلمہؓ (مسلم) [۲] روایت ابن مسعودؓ ——— (مسلم)
[۳] روایت اوس بن شرجیل ——— (بیہقی) [۴] روایت ابراہیم بن میسرہ ——— (بیہقی)

حضورؐ نے فرمایا :۔

"جو شخص فرمانروا (یا حکومت) تک پہنچا ـــــ (اور دوسری روایت کے بموجب) جو شخص فرماں روا (یا حکومت) کے ساتھ وابستہ ہوا وہ فتنہ میں پڑ گیا ۔ اور فرمانروا (یا حکومت) کے قرب میں اضافہ ہونے سے بندے کو سوائے اس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ اللہ سے اتنی ہی دوری بڑھ جاتی ہے[1]۔"

حضورؐ نے اپنی تعلیمات میں بعد کی فاسد حکومتوں کے دور میں آنے والے ایسے علماء کو بھی پیشگی انتباہ دے دیا جو بظاہر بڑے اچھے ارادوں اور منصوبوں کے ساتھ حکومت اور درباروں سے وابستگی اختیار کرنا چاہیں ۔ مثلاً :ـــــ

حضورؐ نے فرمایا :ـــــ

"میری امت کے کچھ لوگ دین میں علم و فہم حاصل کریں گے اور قرآن پڑھیں گے۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہم حکام کے پاس جاتے ہیں تاکہ ہم ان کے ہاں سے دنیوی مفاد حاصل کریں اور اپنے دین کو ان سے بچا لائیں ۔ لیکن ایسا ہوگا نہیں، جیسے کہ خاردار درخت سے کانٹوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا[2]۔"

حضورؐ نے فرمایا :ـــــ

"اگر ایسا ہو کہ اصل علمِ علم کی حفاظت کریں اور اسے صحیح مستحقین تک پہنچائیں۔ (اس کے طالب اور اس پر عمل کرنے والے !) تو وہ اپنے زمانے کے لوگوں کے سردار ٹھہریں، لیکن وہ اسے اربابِ دنیا کے سامنے پیش کریں گے تاکہ اس کے عوض میں ان کے ہاں سے دنیوی مفاد حاصل کریں، سو وہ ان کی نگاہوں میں ذلیل ہو کے رہ جائیں گے۔"

۱ـ روایت مقدام بن معدیکرب ـــــ (ابو داؤد)

۲ـ روایت ابن عباس ـــــ (ابن ماجہ)

فاسد حکومت سے تعاون کرنے میں علماء کو جو انکار تھا وہ انہی تعلیمات کے سبب سے تھا۔ علمائے حق نے حکومت کی پالیسی کے بالمقابل مناصب سے اجتناب کا کڑا رویہ اختیار کیا۔ جیسے کہ ایک بصیرت مند معاصر نے لکھا ہے کہ "فان العلماء علی ما یظھر کانوا یمتنعون عن ان یتبوئوا عملا فی حکومة لا یحبونھا لئلا یکون تائید الھا[1] یعنی جس حکومت کو وہ غلط اور ناپسندیدہ سمجھتے تھے اس کے مناصب پر آنے سے ان کو اس لیے پرہیز تھا کہ اس طرح اس حکومت کو ان کی تائید حاصل ہو جائے گی۔ اسی اصولی رویے کے مطابق امام ابوحنیفہ نے یہ فرمایا تھا کہ "اگر یزید کہے کہ مسجدوں کے دروازے گن دو تو یہ بھی مجھ کو گوارا نہیں، کیونکہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر دستخط کروں[2]۔"

۴:۔ چوتھا امر یہ بھی علمائے حق کے سامنے تھا کہ اموی دور میں فذالکم، مگر عباسی دور میں نہایت صریح طور پر حکومت عدلیہ میں مداخلت کرتی تھی اور علماء حق اس طرح آلۂ کار بننے پر تیار نہ تھے۔ تاریخ اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ:۔

> "اس دور میں عدالت کا محکمہ سیاسی اثر سے آزاد نہ تھا، اس لیے اربابِ زہد و ورع، اہلِ علم اس منصب کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے[3]۔"

مزید ملاحظہ ہو:۔

> "عباسی دور کے قاضی خلیفہ کے اثر و اقتدار سے آزاد نہ تھے۔ بات یہ تھی کہ عباسی فرماں روا اپنے تمام اعمال و افعال کو مذہبی رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے وہ قاضیوں کو اپنا آلۂ کار بناتے تھے اور قاضی کے انتخاب میں اس کا لحاظ رہتا تھا کہ وہ ان کے رجحانات اور خواہشات سے انحراف تو نہیں کرے گا۔

[1] تاریخ القضاء فی الاسلام ۔۔ از محمد بن محمود بن عرنوس مصری ۔ ص ۲، ۷، ۳، ۷

[2] عقود الجمان ۔ باب ۲۱۔

[3] مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے اردو) ۔۔ از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ۔ ص ۳۱۹

اس کا اثر تھا کہ بہت سے فقہاء قضا کے منصب سے دامن بچاتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ شریعت اسلامی، ان کے فرائض منصبی اور ضمیر کے خلاف فتوے دینے پر ان کو آمادہ کیا جائے گا۔[1]"

اس معاملے میں مندرجہ بالا احادیث ان کے سامنے تھیں اور حضورؐ کا یہ ارشادِ مبارک بھی ان کے پیشِ نظر تھا کہ:۔

حضورؐ نے (امارۃ السفہا کے دور کے متعلق) فرمایا:۔

"جو لوگ انکے ہاں گھسے، اور ان کے جھوٹ کو انہوں نے سچائی کا جامہ پہنایا اور ان کے ظلم میں ان کی اعانت کی تو ایسے لوگوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے ـــــ نیز یہ کہ ایسے لوگ مجھ سے حوض کوثر پر آ کر ملاقات نہ کر سکیں گے۔[2]"

پھر قضا کے متعلق یہ خصوصی ارشاد ان کے سامنے تھا کہ صرف وہ قاضی جنت میں جائے گا کہ عرف الحق فقضیٰ بہ یعنی جس نے حق (یعنی قانونِ اسلامی کے صحیح منشا اور فریقین نزاع کے احوال) کو جانا اور دیانت داری سے اس کے متعلق فیصلہ کیا۔ دوسری طرف وہ شخص جس نے حق کو جانا مگر "فجار فی الحکم" فیصلہ دینے میں ظلم سے کام لیا، وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔[3]

ان چار وجوہ سے علمائے حق اور ائمۂ صلحا نے حکومت کے بچھائے ہوئے دامِ مناصب میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا اور دونوں طاقتوں میں بڑی بھاری اور لمبی کشمکش چلی۔ اس کشمکش کی وجہ سے اقتدار پر مسلسل ایسا دباؤ پڑا کہ اس کے ذریعے مطلق العنان اقتدار کے تحت آزادیٔ ضمیر کے ساتھ کام کرنے کی کچھ نہ کچھ راہیں کھلیں۔ علاوہ ازیں دوسری طرف مناصب قضا کے

---

[1] مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے اردو) ـــ از پروفیسر حسن ابراہیم حسن - ص ۳۱۵

[2] روایت کعب بن عجرہ ـــــ ترمذی و نسائی

[3] روایت بریدہؓ ـــــ ابوداؤد و ابن ماجہ۔

اندر سے بھی حق پسند قاضیوں نے عظیم الشان درجے کی لمبی جدوجہد حق اور ضمیر کو بچانے کے لیے جاری رکھی۔

ہم آئندہ قسط میں، واقعاتی مواد سامنے لاکر یہ دکھائیں گے کہ مناصب سے باہر رہ کر اجتناب اور پرہیز کی روش کے تحت اربابِ حق نے کیا کشمکش کی اور پھر ہم اس داخلی کشمکش کی اصل داستان عرض کریں گے جو محدود مناصب پر رہ کر مطلق العنان اقتدار کے خلاف علمائے حق نے جاری رکھی۔ نیز یہ کہ محدود مناصب کی دودھاری تلوار نے علمائے حق اور قضاۃِ امانتدار کے ہاتھوں میں آکر کیا کاٹ دکھائی اور دوسری طرف جب ضمیر کے کمزور اور جاہ پسند اور مفاد پرست لوگ آگے آئے تو پھر اسی تلوار نے مطلق العنان اقتدار کے ہاتھوں میں پہنچ کر کیا عبرت آفرین سماں پیدا کر دیا۔ (باقی)

اسلام کا بین الاقوامی قانون

[درج ذیل مقالہ دراصل امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی مشہور و معروف کتاب "السیر الکبیر" کے تبصرہ و تعارف پر مشتمل ہے جو مصر کے ماہوار رسالہ "المجلۃ" بابت جولائی سنہ ۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ کی اہمیت و ندرت کے پیش نظر ہم قارئین "ترجمان القرآن" کے لئے اسے اردو میں منتقل کر کے شائع کر رہے ہیں۔ مقالہ کے مصنف ڈاکٹر عبدالغنی حسن ہیں جو المجلہ میں بالعموم دینی و تاریخی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ - خ ح]

اسلام کے بین الاقوامی قانون پر سب سے پہلی کتاب اور اس کا سبب تالیف | اسلام کے بین الاقوامی قانون پر سب سے پہلی جو کتاب عالم وجود میں آئی ہے۔ وہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد کی "السیر الکبیر" ہے۔ اس کتاب کا ظہور دراصل "طیش" کا شرمندۂ احسان ہے طیش بلاشبہ ایک ناپسندیدہ صفت ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالےٰ ناپسندیدہ چیز کے بطن سے خیر کثیر برآمد کرتا ہے۔ خیال فرمائیے: ایک مسلمان فقیہ دوسرے مسلمان فقیہ کے ایسے الفاظ پر طیش میں آجاتا ہے جو مؤخرالذکر کی طرف سے اوّل الذکر کے حق میں تنقیص کے انداز میں کہے جاتے ہیں لیکن یہ طیش یا لغوی جذبات اس کے اندر ذاتی کینہ یا حسد یا اسی قبیل کے دیگر سفلی جذبات مشتعل نہیں کرتی بلکہ اس کے اندر عمل بالخیر کا داعیہ تیز تر کر دیتی ہے اور اسے ایک ایسی مضبوط اور ٹھوس کتاب کی تصنیف پر آمادہ کرتی ہے جس سے وہ عالم مذکور کو اپنے الفاظ واپس لینے پر مجبور کر سکے چنانچہ وہ اس کتاب کی تصنیف میں ہمہ تن منہمک ہو جاتا ہے اور آخر کار جامعیت و خوبی کے ہر ممکن تصور کے ساتھ یہ کتاب منظر عام پر آجاتی ہے جس میں اسلامی نقطۂ نظر کے تحت اسلام کے فلسفہ جنگ اور تعلقات خارجہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس موضوع کی ہر گرہ کو خوش اسلوبی سے سلجھایا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ تمام بحث اسلامی حدود کے اندر پوری آزادیٔ فکر و نظر پر مبنی ہوتی ہے اور دوسری طرف ہر بات

کا استناد اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت سے کیا جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسن تدبر، وسعتِ نظر، وفورِ علم اور عمق تفقہ کا بے کراں بحر مصروفِ تلاطم ہے۔

دراصل "السیر الکبیر" سے پہلے امام محمدؒ نے "السیر الصغیر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں مختصراً تعلقاتِ خارجہ، جنگ اور صلح وامان کے بارے میں اسلامی احکام بیان کئے تھے۔ یہ کتابچہ (الصغیر) جب شام کے نامور محدث امام اوزاعیؒ کے ہاتھ لگا تو امام موصوف نے دریافت فرمایا؟ "یہ کس کی تصنیف ہے؟" لوگوں نے بتایا: "یہ محمد بن حسن عراقی کا نتیجۂ فکر ہے" اس پر امام اوزاعی نے کہا۔ اہلِ عراق کو اس موضوع سے کیا واسطہ؟ ان کو سیر (جنگ کے مسائل) کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کے غزوات کا رُخ شام وحجاز کی طرف رہا ہے۔ عراق کی طرف نہیں تھا۔ یہ ملک بعد میں فتح ہُوا ہے۔" امام اوزاعی کے یہ الفاظ جب امام محمد بن حسن عراقی کے کانوں تک پہنچے تو آپ بہت متاثر ہوئے اور سِیَر کے موضوع پر ایک مفصّل اور جامع کتاب لکھنے کا عزم کر لیا۔ اور جب تک اس کتاب سے فارغ نہیں ہو گئے اور کسی شغل کی طرف دھیان نہیں دیا۔ "السیر الکبیر" آپ کی اسی دوسری کاوش کا نام ہے۔

"السیر الکبیر" کا بھی ایک نسخہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ تک پہنچ گیا۔ امام محترم نے جب اس کا مطالعہ کیا اور اس کے تمام مسائل کا جائزہ لیا تو مصنف کی جہدِ عظیم اور طبعِ رسا پر انگشت بدنداں رہ گئے اور فرمایا: "اگر کتاب میں جابجا احادیث سے استناد نہ کیا گیا ہوتا تو میں کہہ اٹھتا کہ مصنّف اس علم (بین الاقوامی قانون) کا خود واضع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مصنف کی نگاہ کو سمتِ حق پر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ فوق کل ذی علم علیم (ہر ذی علم پر ایک بالاتر صاحبِ علم ہے)۔"

رومی قانون دانوں پر سبقت

امام محمد بن حسن شیبانیؒ دوسری صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے نامور شاگردوں میں سے ہیں۔ چار سال تک اپنے استاذ امام کی صحبت

میں رہے ہیں اور پھر امام ابو یوسف سے انہوں نے فقہ کی تکمیل کی ہے۔ امام محمدؒ کی یہ کتاب بلا اختلاف اسلام کے قانون صلح و جنگ اور تعلقاتِ خارجہ کا مایۂ ناز مرجع سمجھی جاتی ہے بلکہ یہ اپنے موضوع پر دنیا میں سب سے پہلی تصنیف شمار ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بین الاقوامی قانون پر کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ رومی مصنفین جنہیں قانون کا استاذ سمجھا جاتا ہے، ان کی فہرستِ تصانیف بھی اس موضوع سے خالی ہے۔ درحقیقت سترہویں صدی سے قبل فرنگی قانون سازوں کو اس موضوع کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا۔ سترہویں صدی میں یعنی امام محمد بن حسن شیبانی کے کئی صدی بعد، گروٹیوس نے بین الاقوامی قانون پر ایک کتاب لکھی جسے اہلِ مغرب کے نزدیک دنیا نے قانون میں بین الاقوامی قانون کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔

السیر الکبیر کی شرح "السیر الکبیر" کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے جب تقریباً تین صدیاں گزر گئیں تو اس کتاب کی عزت و توقیر میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملتِ اسلامیہ کے ایک جلیل القدر عالم نے اس کی شرح املاء کی۔ یہ عالم شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی ہیں۔ جو اپنی اہم تصنیف "المبسوط" کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ شمس الائمہ سرخسی نے السیر الکبیر کی یہ شرح کسی دارالعلوم یا کسی کتب خانہ میں بیٹھ کر نہیں کی ہے بلکہ یہ انہوں نے محض اپنے حافظہ کی مدد سے قید خانے کی تاریکیوں میں املاء کرائی ہے۔

شارح کی داستان عزیمت و ابتلاء السیر الکبیر کی شرح کا تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک شارح — شمس الائمہ سرخسی — کے حوالۂ زنداں ہونے کا پس منظر نہ معلوم ہو جائے۔ پانچویں صدی ہجری میں ماوراء النہر میں خاقان کی حکومت تھی۔ خاقان نے ایک آزاد شدہ لونڈی سے عدت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی نکاح کر لیا۔ خاقان اس پر غیر معمولی حد تک فریفتہ ہو چکا تھا، اس لئے اسے زمانۂ عدت کا انتظار شاق گزر رہا تھا۔ شمس الائمہ کو جب ایک شرعی حکم کی پامالی کی خبر پہنچی تو انہوں نے سلطان کی اس حرکت پر سخت گرفت کی

اور اسے شریعت کی خلاف ورزی پر محمول کیا۔ خاقان نے اگر اتباعِ ھویٰ کا مظاہرہ کیا تھا تو ایک عبقری عالم اسے کیونکر برداشت کر سکتا ہے۔ شمس الائمہ نے بلا خوفِ ملامت اس نکاح کے از روئے شریعت حرام ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ ہوا پرست حکمران کی طرف سے اس جرأت کا جواب یہ تھا کہ فقہ اسلامی کے اس رکن رکین اور علم و فضل کے اس بحرِ ذخار کو ۱۵ سال کے لئے اوزجند کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا[1]۔ لیکن تشنگانِ علم کا رجوع امام موصوف کی طرف برابر جاری رہا۔ شاگردوں کا حلقہ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ جاتا اور اندر سے امام محترم کے علم و عرفان کا بحرِ بے کراں موجزن ہو جاتا ہے اور جو کچھ وہ بولتے جاتے اسے شاگرد لکھتے جاتے فقہ حنفی کی جلیل القدر کتاب "المبسوط" کی پندرہ جلدیں اور "السیر الکبیر" کی مفصل و جامع شرح اسی قید کے زمانے کی تصنیفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصنف اور شارح دونوں کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے

اس لحاظ سے "السیر الکبیر" صرف جہاد بالسیف کا مضمون ہی پیش نہیں کرتی بلکہ یہ کتاب اپنے پس منظر میں جہاد بالنفس، جہاد بالعلم اور جہاد بالحق کی متعدد داستانیں بھی رکھتی ہے۔ کتاب کے الفاظ تو صرف یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی حکومت کو بیرونی ممالک سے اور غیر مسلم رعایا سے تعلقات استوار کرنے کے لیے کن کن اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ مگر ایک طرف صاحبِ کتاب کی روح بین السطور میں یہ پیغام دے رہی ہے کہ جذبات کی گرمی کو آلۂ شر بنانے کے بجائے آلۂ خیر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف شارح کتاب کا زندہ جاوید کارنامہ علمائے حق کو یہ درس دے رہا ہے کہ ایک علم بردار شریعت

---

[1] بعض کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ خاقان نے کچھ ظالمانہ ٹیکس عوام پر عائد کر دیئے تھے۔ جو ان کی استطاعت سے بڑھ کر تھے۔ شمس الائمہ سرخسی نے ان ظالمانہ ٹیکسوں کے خلاف فتوے دے دیا۔ جبر کی پیشانی پر شکن آ گئے۔ اور ہمدردیٔ عوام کی پاداش میں شمس الائمہ کی زندگی کا طویل اور اہم حصہ ایک جبِ عمیق کی نذر کر دیا۔ یہ دونوں واقعات بجائے خود ثقہ روایات پر مبنی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمس الائمہ نے یہ دونوں "جرم" کئے تھے (مترجم)

کی شان یہ ہونی چاہیئے کہ اگر اربابِ اقتدار اللہ کی شریعت کو اپنی اھواء و خواہشات پر قربان کر رہے ہوں تو منقار زیر پر رہنے کے بجائے حق بات کو علی الاعلان کہہ دینا چاہیئے، خواہ اس کی پاداش میں اندھے کنوؤں کی نذر ہونا پڑے، خواہ تختۂ دار پر کھینچ جانا پڑے۔ ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ

حق گوئی و بے باکی اے ہمتِ مردانہ

کتاب کا قبول عام "السیر الکبیر" اور اس کی شرح ہر دور میں ملتِ اسلامی کے اہتمام و شغف کا مرکز رہی ہے۔ "السیر الکبیر" جب لکھی گئی تھی تو ہارون الرشید نے اسے دیکھ کر نہ صرف اظہارِ مسرت کیا بلکہ اسے اپنے عہد کا قابلِ فخر تحفہ قرار دیا اور اپنے دونوں لڑکوں (امین اور مامون) کو اس کتاب کے سماع کے لئے امام محمدؒ کی مجلس میں حاضر ہوتے رہنے کا حکم دیا۔ بعد میں اس کتاب کو دولتِ عثمانیہ کے خلفاء نے سلطان محمود کے عہد سے ممالک یورپ کے خلاف اپنی طویل جنگوں میں احکام جہاد کی اساس اور مرجع قرار دئیے رکھا اور امان و صلح کے تمام معاملات اسی کتاب کی روشنی میں طے ہوتے رہے۔ السیر الکبیر پر کچھ عرصہ ایسا بھی گزرا ہے جب کہ یہ ملتِ اسلامی کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو حیاتِ ثانیہ بخشی اور ایک مسلمان فقیہ عبدالحمید بدوی کو اس طرف راغب کیا۔ موصوف نے اس کا صحیح ترین نسخہ تلاش کرنے کے بعد اس کی اشاعت کا اہتمام کیا[1]۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجے میں بین الاقوامی قانون سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ مغرب کی ایک جماعت نے بھی اپنی توجہات کو اس پر مرکوز کیا اور اس کتاب کے مطالعہ و تحقیق کے لئے گوٹنگن (جرمنی) میں مصنفِ کتاب کی نسبت سے ایک انجمن وجود میں آگئی۔ جس کا نام "انجمن شیبانی برائے انٹرنیشنل لا" رکھا گیا اور ڈاکٹر عبدالحمید بدوی اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ اب عرب لیگ کے شعبہ مخطوطات کے ڈائرکٹر جناب صلاح الدین المنجد کی کوششوں سے یہ کتاب تحقیق و ترتیب

[1] اس سے پہلے حیدرآباد دکن کا دائرۃ المعارف اسے چار جلدوں میں چھاپ چکا ہے عبدالحمید بدوی کی کوشش اس کے کئی سال بعد کی ہے (مترجم)

کے نئے لباس میں ملبوس ہو کر اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ اس نئے ایڈیشن کی خوبی یہ ہے کہ اس کا موازنہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے مخطوطے سے بھی کر لیا گیا ہے جو اس کی شرح کا قدیم ترین مخطوطہ ہے۔ شمس الائمہ کی وفات ۴۹۰ھ میں ہوئی ہے اور مذکورہ مخطوطہ ۶۳۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ عرب لیگ اور اس کے فاضل ڈائرکٹر دونوں اس قابل قدر خدمت پر پوری ملتِ اسلامی کی طرف سے شکر گزاری کے مستحق ہیں۔

کتاب کے مباحث "السیر الکبیر" میں امام محمدؒ نے جہاد و غزوا، سرحدی تحفظات، امان، معاہداتِ صلح، فسخ معاہدات کے احکام، اموالِ غنائم، جنگی قیدیوں کے احکام، مفتوح علاقوں کے احکام، ثالثی ٹربیونل، اسلحۂ جنگ کے بارے میں شرعی ہدایات، جہاد اسلامی کے حدود و آداب اور اسی قبیل کے دوسرے سینکڑوں مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور انہیں بڑی قانونی حکمت، وقتِ نظر اور معنی خیز ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قرآن و حدیث کے دائرے میں رہتے ہوئے فقہ کے نقطۂ نظر کو اسی اسلوب اور مزاج کے ساتھ واضح کیا ہے جو عراقی اسکول کی خصوصیات میں سے ہے۔

شہادت اور حقوق العباد آغاز کتاب میں سب سے پہلے قاری جانسپار راہِ حق کی قدر و منزلت سے آگاہ ہو گا اور اسے حضرت ابو قتادہ کی یہ روایت ملے گی کہ:

"ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد و ثنا کے بعد جہاد کا ذکر کیا اور اس میں آپؐ نے فرائض کے ماسوا کسی چیز کو جہاد سے افضل نہ بتایا۔ ایک آدمی نے اٹھ کر عرض کی: یا رسول اللہ! جو شخص اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہے کیا یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ آپؐ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ہاں۔ جو شخص اللہ کی راہ میں اس حال میں مارا گیا کہ وہ خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے نکلا تھا اور اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور نہ (بہ نیت فرار) پشت دکھائی

بلکہ آگے بڑھتا رہا۔ تو اس کی شہادت تمام گناہوں کے لئے کفارہ ہو گی۔ بجز قرض کے
کیونکہ قرض کے معاملے میں اس سے بہر حال باز پرس ہو گی"

شارح کتاب امام سرخسی نے مذکورہ حدیث کی ایک دوسری مشہور حدیث سے توثیق کر دی ہے "السیف محاء للذنوب الا الدین" (تلوار گناہوں کو بالکل صاف کر دیتی ہے بجز قرض کے) شریعت اسلامی میں حقوق العباد کی جو اہمیت اور تاکید پائی جاتی ہے، شارح ممدوح نے ایک فقیہ کے نقطہ نظر سے اس کو مزید نمایاں کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "شہید اتنا بڑا درجہ حاصل کرنے کے بعد بھی قرض کے متعلق اللہ کی باز پرس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت بندوں کے معاملات کو درست کرنے میں کس قدر اعتنا برتتی ہے۔"

بحری جنگ کی افضلیت امام محمد بحری جنگ کے متعلق توضیح کرتے ہیں: "دوسرے غزوات کی بہ نسبت بحری جنگ میں زیادہ اجر و ثواب پایا جاتا ہے۔" اس پر شارح رقم فرماتے ہیں۔ "یہ نیت جہاد جہاز یا کشتی پر سوار ہو جانا ہی بڑا افضل عمل ہے۔ کیوں کہ جہاد کی یہ نوعیت زیادہ کٹھن اور زیادہ خطرناک ہے۔ اس صورت میں مجاہد سمندر میں داخل ہوتے ہی اپنی جان کو مرضی الٰہی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس لئے گناہوں کے کفارہ میں شہید کو جو درجہ حاصل ہوتا ہے وہ بحری مجاہد کو محض سمندر میں داخل ہونے سے مل جاتا ہے۔" چونکہ جہاد کی خاطر بحری سفر کا جواز ثابت ہے۔ اس لیے شارح حج اور تجارت کی خاطر بھی اس سفر کو جائز قرار دیتے ہیں۔

جنگ میں معمر لوگوں کیساتھ سلوک کی نوعیت جنگ میں معمر لوگوں کو قتل کرنے کے متعلق امام محمد یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ اگر وہ خود برسر پیکار نہ ہوں یا وہ جنگ کے بارے میں اپنی فکر و رائے سے مدد نہ دیتے ہوں تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر وہ خود تلوار لے کر نکلیں یا جنگ میں مددگار ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درید بن صمہ کے ساتھ یہی برتاؤ کیا تھا۔ یہ شخص بوڑھا کھوسٹ تھا۔ لیکن جنگ کا پرزور حامی تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔

دراصل محاربِ دشمن کی طویل العمری اور اسکے حق میں رحم طلب جذبات سے قطع نظر شریعت نے اسلام اور مسلمانوں کی مجموعی مصلحت کو مقدم رکھا ہے۔ ظاہر ہے "اسلامی ریاست" کی بہبود و فلاح ہر دوسری چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لئے فقہ اسلامی کے عراقی اسکول کی نگاہ میں مصلحت عامہ کو مصلحت خاصہ پر ترجیح حاصل ہے۔ امام محمد نے اپنی مذکورہ بالا رائے میں اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ دشمن کے کھیتوں، نخلستانوں اور تاکستانوں کو کاٹنے کے بارے میں بھی عراقی اسکول جو رائے رکھتا ہے۔ اس سے اس اسکول کی فقہی بصیرت کے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً امام اوزاعی۔ جو اصحاب ظواہر میں سے ہیں۔ نص ظاہری سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے دار الحرب کے اندر کوئی ایسا کام کرنا جائز نہیں ہے جو تخریب کی تعریف میں آتا ہو، اس لیئے کہ تخریب فساد ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا لیکن عراقی اسکول کے جلیل القدر نمائندے امام سرخسی اسے جائز قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: جب اسلام نے دشمنوں کا زور توڑنے کے لیے قتلِ نفوس تک کی اجازت دی ہے حالانکہ نفوس انسانی سے بڑھ کر کوئی چیز محترم نہیں ہے، تو اُن سے کمتر اشیاء، مثلاً عمارات کو مسمار کرنا اور درختوں کو اکھاڑنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے۔"

جنگ کے آداب و احکام

اسلام نے مصلحت عمومی کے تحت ہی دورانِ جنگ با آوازِ بلند پکارنا مکروہ قرار دیا ہے الّا یہ کہ بلند آہنگی خود لشکرِ اسلام کے لیے مفید اور ولولہ انگیز ثابت ہو رہی ہو۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تین مواقع پر آواز بلند کرنے کو ناپسند فرمایا ہے: ایک تلاوتِ قرآن کے وقت، دوسرے جنائز میں اور تیسرے دشمن پر حملہ کرتے وقت۔ لیکن بایں ہمہ آپؐ خود مقابلۂ دشمن کے وقت حضرت ابو دجانہ کو برانگیختہ کیا کرتے تھے کہ وہ اپنی گرجدار اور پُر ہیبت آواز کو بلند کریں۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے: "جنگ میں ابو دجانہ کی آواز پورے دستے کا کام دیتی ہے۔"

امام محمد جنگ کے دوران "قتلِ خطا" اور "قتلِ خطا نما" کا نہایت باریک اور لطیف

فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں : اگر رات کے وقت مسلمان فوج کے دو دستے باہم متصادم ہو گئے ، دونوں میں سے ہر ایک نے فریقِ مقابل کو مشرکوں کا دستہ سمجھا، چنانچہ انہوں نے آپس میں تلوار چلائی اور کچھ لوگ قتل ہو گئے۔ پھر انہیں حقیقت حال کا علم ہو گیا تو ایسی صورت میں مقتولین کے سلسلہ میں ان پر کوئی دیت اور کفارہ نہ ہو گا۔ امام موصوف نے اپنی اس رائے کی بنیاد حضرت جابر بن عبداللہ کی اس روایت پر قائم کی ہے :

"غزوۂ خندق میں ایک مرتبہ رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ و سلّم کے لشکر میں سے دو دستے گردش کے لیے نکلے اور رات کی تاریکی میں دونوں کی آپس میں مڈھبیڑ ہو گئی۔ ان میں سے ایک دوسرے کو بالکل نہ پہچان سکا بلکہ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ فریقِ مقابل دشمن گروہ میں سے ہے۔ اس تصادم میں کچھ زخمی ہو گئے اور کچھ مارے گئے۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے اسلامی شعار کا نعرہ مارا تو دونوں فریق یکایک لڑائی سے رک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا :

"تمہارے زخم اللہ کی راہ میں ہیں اور جو تم میں سے مارے گیے ہیں وہ شہید ہیں"۔

البتہ اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ مشرکین سے برسرپیکار تھا اور ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو مشرک سمجھ کر قتل کر دیا، یا اس نے تیر پھینکا مگر وہ مشرک کو نہ لگا بلکہ کسی مسلمان کو جا پیوست ہوا اور وہ مر گیا تو اس صورت میں اس شخص پر دیت بھی ہو گی اور کفارہ بھی۔ ان دونوں حالتوں میں نہایت باریک فرق ہے۔ امام سرخسی اسی باریک فرق کو یوں بے نقاب کرتے ہیں کہ پہلی حالت میں مسلمانوں کے دونوں دستوں میں سے ہر ایک نے اپنی جائز مدافعت کی۔ بے شک ان میں سے ہر ایک دستہ دوسرے دستے کو حملہ آور سمجھتا تھا اور خود اپنی مدافعت میں لڑ رہا تھا۔ اس مدافعت کا وہ شرعاً مکلّف ہے۔ لہٰذا یہ مدافعانہ کارروائی موجبِ دیت و کفارہ نہ ہو گی۔ دوسری حالت میں یہ قتل خطأ کی واضح صورت ہے۔ اور

قتلِ خطا میں دیت و کفارہ بروئے نص واجب ہے۔"

مسلمان مجاہدین کو میدانِ جنگ میں بعض ایسی مشکلات پیش آجاتی ہیں جن کے بارے میں اس جامع کتاب کے اندر اطمینان بخش حل اور واضح جواب مل جاتا ہے۔ مسلمان سپاہی دشمن فوج کے مقتولین کے سر کاٹ کر اپنے افسروں اور حکمرانوں کے پاس اگر لائیں تو کیا شرعاً یہ درست ہوگا؟ - امام محمد نے اس قضیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے عُقبہ بن عامر جُھنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا ہے۔ عقبہ بن عامر ایک غزوے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس "نیاق البطریق" کا سر کاٹ لائے۔ آپؓ نے اسے سخت ناپسند کیا۔ عرض کیا گیا: "اے خلیفۂ رسول! یہ لوگ ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں"۔ خلیفۂ اوّل نے فرمایا: "کیا ہم بھی فارس و روم کی ڈگر پر چلنا شروع کردیں؟ آئندہ میرے پاس کسی کا سر نہ لایا جائے۔ صرف خط لکھ دینا اور خبر بھیج دینا کافی ہے"۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "یہ تم لوگوں نے زیادتی کی ہے اور اپنی حد سے صریح تجاوز کیا ہے"۔ شارح ممدوح اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "بعض علماء نے خلیفۂ اوّل کے ظاہری الفاظ سے تمسّک کیا ہے اور کہا ہے کہ دشمنوں کے سر کاٹ کر حکام کو پیش کرنا حلال نہیں ہے۔ کیونکہ یہ میت ہے اور میت کو سڑاند سے بچانے کے لیے فوراً دفن کر دینا چاہیئے۔ نیز سروں کا کاٹنا مُثلہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے مُثلہ سے منع فرمایا ہے خواہ وہ باؤلے کتے کی لاش ہی کیوں نہ ہو۔ نیز حضرت ابوبکرؓ کی وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جاہلیّت کا فعل ہے اور فارس و روم کے طریقہ کی پیروی ہے"۔ لیکن شارح ممدوح خود اپنی اور اپنے ہم مسلک علماء کی رائے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہمارے اکثر مشائخ رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مقتول مشرکین کا کوئی بڑا سرغنہ ہو یا ان کا کوئی سرکردہ جنگ آزما ہو اور اس کا سر کاٹ کر لانے میں مشرکین کو آتشِ غیظ میں جلانا یا اہلِ اسلام کے دلوں کو ٹھنڈا کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں کوئی

حرج نہیں ہے"۔ امام سرخسی اس مسلک کا استدلال ابوجہل کے واقعہ سے کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود غزوۂ بدر میں اس ہٹ دھرم مُشرک کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپؐ کے سامنے لاکر ڈال دیا اور عرض کیا: یہ آپ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: "اللہ اکبر، یہ میرا فرعون اور میری امت کا فرعون تھا۔ اس کی شرانگیزی مجھ پر اور میری امت پر موسیٰ اور ان کی امت پر فرعونِ مصر کی شرانگیزی سے زیادہ تھی"۔ الغرض آپ نے نہ اس فعل سے منع فرمایا اور نہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

جنگی تدابیر اسلحہ اور شہسواری کے باب میں امام محمد اور امام سرخسی نے ایسا کوئی پہلو ترک نہیں کیا جو اس موضوع سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں حضرات نے اس موضوع کو زیادہ سے زیادہ جامع اور کامل بنانے کی کوشش کی ہے۔ صاحبُ "السیّر الکبیر" روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اہل لشکر کو لکھا کہ "دشمن کی سرزمین میں اپنے ناخنوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھاؤ، یہ بھی ایک ہتھیار ہے۔ اگرچہ ناخن اتروانا سننِ فطرت میں سے ہے لیکن دارالحرب میں مجاہدین کے لیے ان کا بڑھانا مستحب ہے"۔ شارح سرخسی نے جنگ میں ناخن بڑھانے کی حکمت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے: جب کسی مسلمان سپاہی کے ہاتھ سے ہتھیار گر جائے اور دشمن سر پر آپہنچے تو مسلمان سپاہی ناخنوں کی مدد سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے۔ یہ وہی صورت ہے جو مونچھوں کے بارے میں اختیار کی جاتی ہے۔ مونچھیں کتروانا سنّت ہے لیکن غازی کے لیے دارالحرب میں مونچھوں کو بڑھانا مستحب ہے تاکہ دشمن کے دل اس سے خوف زدہ ہوں اور مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو"۔ موجودہ دور میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور میدانِ جنگ کے اندر ہر ملک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے سپاہی ایسی ہیئت میں نمودار ہوں کہ انہیں دیکھ کر دشمن کے دل مرعوب و مغلوب ہوں۔ لیکن فوج کے وہ یونٹ جو برسرِ جنگ نہیں ہوتے اُن میں یہ تدبیر اختیار نہیں کی جاتی بلکہ انہیں نفاست اور

صفائی کا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ امام محمد اور امام سرخسی کے بیانات سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ ہر وہ اسلحہ جو جنگ میں فوج کے لیے باعثِ نصرت ہو سکتا ہو اس کا استعمال ضروری ہے خواہ وہ فطری ذوق کے خلاف ہو۔ ناخن کاٹنا فطرتِ سلیم کا تقاضا ہے لیکن جنگی استعمال کے لیئے ان کو بڑھانا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

جنگ میں وہ امور بھی جائز ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں جائز نہیں ہوتے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے "جنگ ایک چال ہے"۔ امام سرخسی نے اس ارشادِ نبویؐ پر مفصّل کلام کیا ہے۔ موصوف اس سے استدلال کرتے ہیں کہ "مجاہد اگر ہنگامِ قتال اپنے حریف کو دھوکہ دیتا ہے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے اور نہ ایسی کوئی چال غداری شمار ہوگی بعض علماء مذکورہ حدیث کے ظاہری الفاظ کی بنا پر کہتے ہیں: قِتال میں جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہے۔ ان کا مزید استدلال یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جھوٹ بولنا درست نہیں ہے مگر تین صورتوں میں: دو آدمیوں میں صلح کرانے کے لیے، قتال کے وقت، اور مرد کو اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لیے"۔ لیکن ہمارا مسلک یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کذب سے مراد کذب محض نہیں ہے۔ کیونکہ کذب محض کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے بلکہ آپ کی مراد توریہ اور ذومعنی کلام کا استعمال ہے۔ اس کی نظیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کذبات ثلاثہ والی حدیث میں ملتی ہے۔ اس حدیث میں بھی کذبات سے مراد توریہ ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کذب محض کے ارتکاب سے پاک ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ ذومعنی کلام سے انسان کذب محض کے ارتکاب سے بچ جاتا ہے"۔

امام محمد نے جنگی چالوں کا مفصّل جائزہ لیتے وقت اپنے حیرت انگیز تخلیقی ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً وہ بتاتے ہیں کہ ایک جنگی چال یہ بھی ہے کہ مجاہد اپنے مبارز سے کسی ایسی بات کا ذکر کرے جو امرِ واقع نہ ہو یعنی زبان پر کچھ اور ہو اور دل میں کچھ اور۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوہ خندق میں کیا تھا۔ حضرت علیؓ کو جب عمرو بن عبدوُدّ نے دعوتِ مبارزت

دی تو حضرت علیؓ نے کہا: کیا تو نے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو میرے مقابلے کے لیے اپنے سوا کسی اور سے مدد طلب نہیں کرے گا؟ یہ کون لوگ ہیں جنہیں تو بُلا لایا ہے؟ عمرو بن عبد وُدّ نے حیران ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو حضرت علیؓ نے یکایک اس کی پنڈلیوں پر تلوار کا وار کیا اور اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر رکھ دیں۔ حضرت علیؓ کی یہ نہایت کامیاب چال تھی۔ اور اُسی قبیل سے تھی جو جنگوں کے اندر جائز ہوا کرتی ہے۔ امام محمد نے اس نوعیت کی مثالوں کا ایک اچھا خاصا مجموعہ مرتب کر دیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "یہ جنگی حربے ہیں ان کے استعمال میں کوئی مضایقہ نہیں ہے"۔

مخادعت اور دھوکہ دہی کا طریقہ دورانِ جنگ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور خاتمہ پر بھی، لیکن اگر معاملہ امان تک پہنچ جائے تو مسلمان سپاہ اپنے معاہدے پر کاربند رہنے کی مکلّف ہے۔ اور اگر امام مسلمین کسی دشمن قوم کو امان دے دیتا ہے اور پھر اُسے امان منسوخ کر دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ دشمن کو اطلاع دے کر ہی امان کو منسوخ کر سکتا ہے۔ نیز اگر امان کی مہلت گزر جائے تو مسلمانوں کو اختیار ہے چاہے وہ اس کی تجدید کر دیں اور چاہے منسوخ کر دیں۔

مصنف رحمہ اللہ نے امان کے باب میں جن طرفہ واقعات کو بیان کیا ہے ان میں سے ایک ہُرمزان فارسی جسے مسلمانوں نے گرفتار کر لیا تھا، کا مکالمہ ہے۔ ہُرمزان کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو حضرت عمرؓ نے ہُرمزان سے کہا، "اب کہو کیا کہتے ہو"۔ ہرمزان نے پوچھا، "کیا زندہ انسان کی سی بات چیت کروں یا مردہ کی سی؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "زندوں کی سی بات چیت کرو"۔ ہُرمزان بولا: ہم اور تم دونوں جاہلیت کی گود میں تھے۔ نہ ہمارا کوئی دین تھا اور نہ تمہارا۔ ہم لوگ تم عربوں کو کتّوں کے برابر سمجھا کرتے تھے۔ جب اللہ نے تمہیں دین سے سرفراز کیا اور تمہارے اندر ایک رسول کو مبعوث کیا تو ہم نے تمہاری اطاعت سے انکار کیا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا، "کیا تو ہمارے ہاتھوں میں اسیر ہو کر بھی ایسی باتیں کرتا ہے؟"

پھر آپ نے حکم دیا: "اس کی گردن اڑا دو"۔ ہرمزان بول اٹھا: "کیا تمہارے نبیؐ کی یہی تعلیم ہے کہ تم پہلے ایک اسیر کو پناہ دے دو اور پھر اس کو قتل کر ڈالو؟" حضرت عمرؓ نے کہا: "میں نے کب تجھے امان دی ہے؟" ہرمزان نے بتایا: "آپ نے مجھے کہا کہ زندہ انسان کی طرح بات چیت کرو۔ مگر جسے جان کی امان نہ ہو وہ تو زندوں میں شمار ہی نہیں ہوتا"۔ اس پر حضرت عمرؓ فوراً متنبہ ہوئے اور کہنے لگے: "اس پر خدا کی مار، اس نے ہم سے امان حاصل کر لی اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی"۔

علی ہذا القیاس یہ کتاب تمام بین الاقوامی مسائل و قوانین کا ایک نہایت جامع اور حکمت آمیز دفتر ہے۔ اس کا تازہ ایڈیشن ان تمام اغلاط سے پاک ہے جو آج سے ۲۴ سال قبل حیدر آباد سے شائع ہونے والے ایڈیشن میں پائی جاتی ہیں۔

رسائل و مسائل

تصوّف سے متعلق چند تصریحات

سوال :- میں دعوت الی اللہ اور اقامت دین اللہ کے کام میں آپ کا ایک خیر خواہ ہوں، اور مل کر کام کرنے کی ضرورت کا احساس رکھتا ہوں، میں آپ کی طرف سے لوگوں کے اس اعتراض کی مدافعت کرتا رہتا ہوں کہ آپ تصوّف کو نہیں مانتے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے میرے ایک سوال کا جواب یہ دیا تھا کہ "میرے کام میں اہل تصوّف اور غیر اہل تصوّف سب کی شرکت کی ضرورت اور گنجائش ہے۔ باقی میں چونکہ صوفی نہیں ہوں، تو مکاّرتو نہیں بن سکتا کہ خواہ مخواہ تصوّف کا دعویٰ کروں۔" آپ کا یہ جواب سیدھا سادا اور اچھا تھا۔ مگر قلم کی لغزش انسان سے ہو سکتی ہے۔ آپ اپنے رسالہ ہدایات (ص ۱۳) میں لکھتے ہیں:

"ذکر الٰہی جو زندگی کے تمام احوال میں جاری رہنا چاہیے۔ اس کے وہ طریقے صحیح نہیں ہیں۔ جو بعد کے ادوار میں صوفیاء کے مختلف گروہوں نے خود ایجاد کیے یا دوسروں سے لیے۔" یہ چوٹ اگر آپ جمیع صوفیہ پر نہ کرتے تو آپ کی دعوت کو کیا نقصان پہنچتا۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو واقعی صوفیہ کا حال معلوم نہیں یا آپ صوفیہ سے نفرت ظاہر کر کے تحریک اسلامی کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اس لیے ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اپنی اس عبارت میں تبدیلی کر دیں گے۔"

جواب :- کسی مسئلے میں کسی شخص یا گروہ سے اختلاف کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ آدمی اس شخص یا گروہ کا مخالف ہے یا اس کا دشمن ہے، یا جملہ مسائل میں اسے غلط کار سمجھتا ہے۔ آخر آپ حضرات خود

شوافع حنابلہ اور مالکیہ کی بہت سی آراء سے اختلاف کرتے ہیں اور بسا اوقات بڑے زور شور سے ان کی آراء کے خلاف استدلال کرتے ہیں۔ کیا اس کے یہ معنی لینے ہیں کوئی شخص حق بجانب ہو گا گر آپ ان ائمۂ ثلاثہ اور ان کے پیرو علماء کے مخالف ہیں اور ان کو قاطبۃً خطا کار قرار دیتے ہیں اور ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں؟

اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ آپ اپنے اس طرز فکر پہ نظرِ ثانی فرمائیں اور اختلاف رائے کو مخالفت و عداوت اور عناد کے ساتھ خلط ملط نہ فرمائیں۔

میرا اصل نظریہ ہے کہ اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کا جو طریقہ قرآن و سنّت اور عمل صحابہؓ سے ثابت ہے وہی کافی ہے اور اسی پر ہمیں اکتفا کرنا چاہیئے۔ اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے اور اس میں کمی و بیشی کرنا نہ درست ہے نہ مفید۔ اس سے ہٹ کر جو طریقے جس نے بھی ایجاد کیے ہیں یا دوسرے ادیان و ملل کے متبعین سے اخذ کیے ہیں، ان سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اس رائے میں اگر کوئی غلطی ہے تو آپ اس پر مجھے دلائل کے ساتھ متنبہ فرمائیں۔ میں پھر اس پر غور کروں گا۔ لیکن میں اس الزام سے براءت ظاہر کرتا ہوں کہ اس اختلافِ رائے کی وجہ سے میں صوفیاء کا مخالف ہوں، یا تصوف کا دشمن ہوں، یا اہلِ تصوف کو بالکلیہ مطعون کرتا ہوں۔

سوال :- آپ نے تھوڑی سی بدگمانی سے کام لے کر یہ سمجھا کہ شاید میں اختلاف اور مخالفت میں فرق نہیں کرتا۔ الحمد للہ مولانا ...... رح نے ہم کو ایسی تربیت دی کہ ہم دونوں میں فرق کریں۔ اصلاحِ باطن کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے بعینہٖ یہی نصیحت ہم اپنے متعلقین کو کرتے ہیں۔ ہم میں اور آپ میں شاید کوئی لفظی اختلاف ہو رہا ہے۔ مثلاً شوافع و حنابلہ سے ہم اختلاف کرتے ہیں مگر ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ امام شافعیؒ کی رائے غیر صحیح یا باطل ہے۔ مزید آپ فرماتے ہیں کہ وہ طریقے صحیح نہیں ہیں جو بعد کے ادوار میں صوفیاء کے مختلف گروہوں نے ایجاد کیے یا دوسروں سے لیے ہیں ان کی کچھ مثالیں

دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ نیز یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جو شخص صحیح کے خلاف طریقے پر ہے اس کو آپ کیا فرمائیں گے؟ میں تو اس کے ساتھ صرف اختلاف نہیں بلکہ مخالفت بھی رکھتا ہوں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ ایک شخص کو صحیح کے خلاف طریقے پر بھی سمجھیں اور پھر اس کے ساتھ مخالفت بھی نہ رکھیں۔

جو طریقہ کتاب و سنت سے ہٹ کر نہ ہو بلکہ اس کی روح اور مغز تک پہنچنے کے لیے ایجاد کیا گیا ہو، اس کو غالباً آپ اپنے اصول کے مطابق اجتہاد فرمائیں گے (بدعت نہیں فرمائیں گے)۔ اسے قبول کرنے نہ کرنے کا آپ کو اختیار ہے مگر اسے باطل یا غیر صحیح نہیں فرما سکتے۔ اگر فرمائیں گے تو پھر اس سے نہ صرف اختلاف ملا ہو گا بلکہ مخالفت ضروری ہو گی۔

ان امور کے بارے میں تصریح فرما دیں تو بحث ختم ہو جائے گی

جواب:۔ پچھلے عنایت نامے کے جواب میں شاید میں اپنی بات آپ کے سامنے پوری طرح واضح نہ کر سکا اسی لیے آپ کو پھر اس سلسلے میں کچھ ارشاد فرمانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ورنہ اگر میرا مدعا آپ پر واضح ہو جاتا تو امید نہ تھی کہ یہ ضرورت محسوس ہوتی۔ میں مختصراً اپنی بات کی پھر وضاحت کرتا ہوں۔

یہ تو آپ جیسے صاحب علم سے مخفی نہیں ہے کہ اَلْمُجْتَھِدُ یُخْطِیُٔ وَیُصِیْبُ۔ پھر یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ سلف سے خلف تک اہلِ علم نے نہ تو یہ طریقہ کبھی اختیار کیا ہے کہ جس کے فضل و شرف کے قائل ہوں اس کو بے خطا سمجھیں، اور نہ ہی ان کا طریقہ رہا ہے کہ جس کے اجتہاد میں کسی چیز کو غلط اور خطا سمجھیں اس کی مخالفت پر اتر آئیں اور اس کے فضل کا انکار کر دیں۔ اس کے بجائے انہوں نے جس چیز کو خطا سمجھا اسے دلیل کے ساتھ رد کیا، مگر اجتہاد کی غلطی کو کسی صاحب فضل کے فضل میں قادح نہیں مانا۔ وہ خطائے اجتہادی کو خطا بھی کہتے تھے اور اس سے اختلاف بھی کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ مجتہد کا احترام بھی ملحوظ رکھتے تھے اور اس کی خطا کے سبب سے اس کے صواب پر پانی نہ پھیر دیتے تھے۔

یہی مسلک اس معاملہ میں میرا بھی ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ مثلاً جن بزرگوں نے سماع کو تقرب الی اللہ کے ذریعہ کی حیثیت سے اختیار کیا، ان کا اجتہاد صحیح تھا یا مثلاً جن حضرات نے تصورِ شیخ کا طریقہ اختیار کیا وہ اپنے اجتہاد میں صائب تھے۔ میں ان چیزوں کو غلط سمجھتا ہوں اور ان سے اختلاف کرنا اور لوگوں کو ان سے اجتناب کا مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ان صوفیائے کرام کی شان میں کوئی گستاخی کرنا درست نہیں سمجھتا جن کی طرف یہ طریقے منسوب ہیں۔

امارتِ شرعیہ بہار کا سوالنامہ اور اس کا جواب

محترم بندہ سلام مسنون

دارالافتا امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ (ہند) کے پاس جماعتِ اسلامی سے متعلق سوالات آتے رہتے ہیں جن میں اس طرف زیادتی ہے۔ سوالات میں زیادہ جماعت اسلامی اور اس کے ممبروں کی دینی حیثیت کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ جماعت اسلامی کے ذمہ داروں سے براہ راست ذیل کے دفعات (جن کے متعلق سوالات آتے ہیں) سے متعلق استفسار کرایا جائے اور آپ حضرات سے ان کے جوابات طلب کر لیے جائیں تاکہ ان جوابات کی روشنی میں ہمیں جماعت اسلامی اور اس کے ممبروں اور ہمدردوں کی دینی حیثیت سے متعلق رائے قائم کرنے میں اور شرعی حکم بتلانے میں سہولت ہو۔ ہمارے خیال میں اس طرح اطمینان حاصل کیے بغیر کوئی شرعی حکم لگانا احتیاط کے خلاف ہوگا۔ آپ سے عرض ہے کہ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب پورے اختصار کے ساتھ حتی الامکان محض نفی و اثبات میں اس طرح تحریر فرمائیں کہ ہمیں واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں جماعت اور اس کے ذمہ داروں کا مسلک اور رائے یہ ہے۔ یہ خیال رہے کہ بعض دفعہ تطویل سے بات واضح ہو جانے کے بجائے اور مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ہمارا مقصد آپ پر کوئی اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ جماعت کے متعلق مندرجہ ذیل مسائل میں تشفی کرنا ہے

اور جماعت اور اس کے ممبروں کی دینی حیثیت بتلانے میں اپنے لیے سہولت مہیا کرنا ہے مجھے امید ہے کہ آپ اس تحریر کو مخالفانہ تصور نہ فرمائیں گے۔ اس لیے کہ یہ اس جذبہ سے لکھی بھی نہیں گئی ہے۔ بلکہ اسے اپنے ہمدرد کے سوالات سمجھ کر جواب تحریر فرمائیں گے۔

(۱) آپ حضرات کے خیال میں صحابہ کرام (علیہم الرضوان) کا اجماع شرعی طور پر حجت ہے یا نہیں؟

(۲) صحابہ کرام (علیہم الرضوان) کو برا بھلا کہنے والا ان کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرنے والا جو دینداروں کی شان سے بعید ہیں فاسق و گنہگار ہے یا نہیں؟

(۳) فرائض کا تارک اور گناہ کبیرہ کا مرتکب آپ حضرات کے خیال میں مسلمان ہے یا نہیں؟

(۴) تصوف (مروجہ نہیں) جس کی دوسری تعبیر احسان و سلوک بھی ہے، جس کی تعلیم اکابر نقشبندیہ چشتیہ سہروردیہ قادریہ وغیرہ نے دی ہے جیسے حضرت شیخ شہاب الدین محمد نقشبند۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی علیہم الرحمۃ اس تصوف کو آپ حضرات دین کے لیے مفید سمجھتے ہیں یا مضر؟

(۵) کسی روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب کرنے میں اولی درجہ صحت روایت کو ہے یا درایت کو۔ وہ درایت جو حدیث کی صحت کی جانچ کے لیے مدار بنے آپ کے نزدیک اس کی تعریف کیا ہے؟

(۶) جماعت اسلامی کے ممبروں اور ہمدردوں کے سوا ہندوستان کے عام مسلمان جو اپنے کو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں اور جو آپ کی اصطلاح میں محض نسلی مسلمان ہیں وہ شرعی اعتبار سے دائرہ اسلام میں ہیں یا اس سے خارج؟

(۷) آپ کے نزدیک معیار حق ہونے کا مطلب کیا ہے اور اس مطلب کے مطابق صحابہ کرام

معیار حق ہیں یا نہیں؟

(۸) ایک مسلمان کے لیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے نفس تقلید فرض ہے یا نہیں اور تقلید شخصی کا درجہ آپ کے نزدیک کیا ہے۔ اور آپ کے نزدیک تقلید شخصی کو واجب کہنے والے لائق تحسین ہیں یا قابلِ ملامت؟

(۹) کیا آپ اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ انبیاء کرام سے لغزش کرائی ہے؟

(۱۰) نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد ان عبادات میں شرعاً مقصود بالذات کون سی عبادت ہے اور اولی درجہ کس کو حاصل ہے۔ کیا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسلام میں مقصود نہیں۔ بلکہ ان کی حیثیت ذرائع اور وسائل کی ہے، مقصود دراصل جہاد ہے؟ یہ عقیدہ آپ کا ہے یا نہیں؟

(۱۱) کلمہ شہادت پر اقرار کے چار پانچ روز یا چار پانچ گھنٹے بعد ایک شخص کی وفات ہو گئی اور باوجود استطاعت کے اس نے ایک مسلمان قرض خواہ کے قرض کو ادا نہیں کیا۔ آپ اس کو مسلمان سمجھتے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھیں گے یا نہیں؟

(۱۲) ایسے مسلمان جو سرکاری دفاتر میں ملازم ہیں یا گورنمنٹ کی عدالتوں میں جج اور مجسٹریٹ ہیں اور ان کے ہاتھوں قانون ہند کا نفاذ ہوتا ہے یا مجالس قانون ساز کے رکن ہیں اور قانون سازی میں حصہ لیتے ہیں یہ لوگ آپ کے نقطہ نظر سے دائرہ اسلام میں داخل ہیں یا نہیں؟ اور آپ حضرات کے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے ایسے لوگوں کا کیا حکم ہے۔

جواب:۔ محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

یاد فرمائی کا شکریہ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسروں کے متعلق فتوے دینے کی ذمہ داری آپ حضرات خواہ مخواہ اپنے ذمہ لیتے ہی کیوں ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ لوگوں کے متعلق مجھ سے دریافت کرے تو میں پہلے ہی معذرت پیش کر دوں گا اور کوئی سوالنامہ مرتب کر کے آپ کے پاس نہ بھیجوں گا۔ تاہم چونکہ آپ نے یہ سوالات بھیجنے کی تکلیف اٹھائی ہے اس لیے مختصر جوابات حاضر ہیں۔

۱:۔ جی ہاں ۔ میرے نزدیک صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے۔

۲:۔ صحابۂ کرام کو برا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے۔ من ابغضھم فببغضی ابغضھم

۳:۔ ہم اسے مسلمان مانتے ہیں، مگر اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں

۴:۔ ہمارے نزدیک ہر وہ چیز جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے مطابقت رکھتی ہے وہ مفید ہے اور جو مطابقت نہیں رکھتی وہ مضر ہے۔ اسی کلیے میں تصوف بھی آجاتا ہے۔ تصوف میں بھی کتاب و سنت کے مطابق جو کچھ ہے، حق ہے، اس کا مفید ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن جو آمیزش بھی کتاب و سنت سے ہٹی ہوئی ہے اس سے ہم اجتناب کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

۵:۔ احادیث کی تحقیق میں دیکھنے کی پہلی چیز حدیث کی سند ہے۔ اس کے بعد درایت کا درجہ آتا ہے۔ درایت سے مراد یہ ہے کہ حدیث کے مضمون پر غور کر کے دیکھا جائے کہ وہ قرآن مجید اور سنت ثابتہ کے خلاف تو نہیں پڑتی؛ اس کی تائید کرنے والی دوسری روایات موجود ہیں یا نہیں؛ کوئی بات اگر فرمائی گئی ہے یا کوئی عمل اگر کیا گیا ہے تو کس موقع پر کیا گیا ہے اور اس موقع سے اس کی مناسبت کیا ہے؟ وغیرہ۔

۶:۔ جماعت اسلامی میں شامل ہونا ہمارے نزدیک مسلمان ہونے کے لیے شرط نہ کبھی تھا نہ اب ہے، نہ ہم اس حماقت میں انشاء اللہ کبھی مبتلا ہو سکتے ہیں کہ جو اس جماعت میں نہیں ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔ جماعت سے باہر کے تمام مسلمانوں کو ہم نے "نسلی مسلمان" نہیں کہا ہے بلکہ ان لوگوں کو کہا ہے جو دین کے علم و عمل سے بے بہرہ ہیں اور اپنے اخلاق و عادات اور اعمال میں اسلام کی کھلی کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

۷:۔ ہمارے نزدیک معیارِ حق سے مراد ہے وہ چیز جس سے مطابقت رکھنا حق ہو اور جس کے خلاف ہونا باطل ہو۔ اس لحاظ سے معیار حق صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ

کی سنت ہے۔ صحابہ کرام معیارِ حق نہیں ہیں بلکہ کتاب و سنت کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ کتاب و سنت کے معیار پر ہی جانچ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ گروہ برحق ہے۔ ان کے اجماع کو ہم اس بنا پر حجت مانتے ہیں کہ ان کا کتاب و سنت کی ادنیٰ سی خلاف ورزی پر بھی متفق ہو جانا ہمارے نزدیک ممکن نہیں ہے۔

۸:۔ مسلمان کے لیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید فرض ہے۔ رہی ائمہ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید، تو ہم ایسے مسلمانوں کے لیے اس کو ضروری سمجھتے ہیں جو خود مسائل شرعیہ کی تحقیق کرنے کے اہل نہ ہوں۔ رہے تحقیق کی قابلیت رکھنے والے لوگ، تو اگر وہ کسی امام مجتہد کے اقوال کی صحت پر مطمئن ہوں تو ہمارے نزدیک ان کا اتباع قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اگر تحقیق سے وہ کسی مسئلے میں اپنے امام کے سوا کسی دوسرے امام کے قول کو اوفق بالکتاب والسنۃ سمجھتے ہوں، لیکن قصداً اپنے امام ہی کی تقلید کریں تو یہ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔

۹:۔ جی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں، اس لیے ان سے لغزش کا صدور اس بنا پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا، بلکہ اس بنا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں، خدائی صفات کے حامل نہیں ہیں۔

۱۰:۔ میرے نزدیک مقصود دراصل اقامتِ دین ہے۔ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اس دین کے ارکان ہیں جن پر یہ دین قائم ہوتا ہے اس لیے ان کو قائم کرنا اقامتِ دین کے لیے مطلوب ہے۔ اور جہاد چونکہ دین کو اس کے پورے نظام کے ساتھ قائم کرنے کا ذریعہ ہے اس لیے وہ بھی اقامتِ دین ہی کے لیے مطلوب ہے۔ سوال کے آخری حصہ کا جواب حضرت معاذ بن جبل والی حدیث میں موجود ہے۔ الا ادلک برأس الامر وعمودہ وذروۃ سنامہ؟ قال بلیٰ یا رسول اللہ۔ قال رأس الامر الاسلام وعمودہ الصلوٰۃ وذروۃ سنامہ الجہاد۔

۱۱:۔ یقیناً میں اس کی نماز جنازہ پڑھوں گا۔

۱۲:۔ میرے نزدیک وہ دائرۂ اسلام سے خارج نہیں۔ میں ان کو مسلمان سمجھتے ہوئے ہی یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم وہ کام کر رہے ہو جو مسلمان کے کرنے کا نہیں ہے۔

مطبوعات

فقہ السنہ (حصہ اول) تالیف جناب محمد عاصم صاحب، شائع کردہ مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد قیمت آٹھ روپے۔

اس کتاب میں مسلمانوں کے پانچ مشہور ترین مذاہب فقہیہ (مذاہب اربعہ اور مسلک اہل حدیث) کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے مسائل و احکام کو دلائل شرعیہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک ضخیم تر تالیف کا پہلا مطبوعہ حصہ ہے اور اس میں صرف طہارت اور نماز کے مسائل جمع کیے گئے ہیں۔ انداز ترتیب یہ ہے کہ اس کے متن میں بالعموم وہ مسائل بیان کیے گئے ہیں جو تقریباً متفق علیہ ہیں اور جن جزئی تفصیلات میں اختلاف ہے، انہیں حواشی میں الگ الگ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر مسلک کے مفتیٰ بہ اور معمول بہ قول کو صرف نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے حق میں جو دلائل کتاب و سنّت یا قیاس و اجتہاد پر مبنی ہیں انہیں بھی مجملاً بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے ایک عام مسلمان بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ اہلِ اسلام کا کوئی مسلّم فقہی مکتب ایسا نہیں ہے جس کے مستنبط کردہ مسائل و جزئیات عمومی اعتبار سے بے اصل اور بے بنیاد ہوں یا کتاب و سنّت کے دائرے میں ان کے لیے کوئی گنجائش موجود نہ ہو۔ ان فقہی مذاہب میں فرق و امتیاز حق اور باطل کا نہیں بلکہ بحث و اختلاف جو کچھ بھی ہے وہ افضل اور مفضول راجح اور مرجوح میں ہے۔ اتنی اصولی بات اگر ہر شخص کے ذہن نشین ہو جائے تو یہ صورت بالکل گوارا بلکہ ایک حد تک ناگزیر اور مطلوب ہے کہ ایک عامی مسلمان ان معروف اور جانے پہچانے فقہی مسالک سے اجمالی تعارف حاصل کر لینے کے بعد ان میں سے کسی ایک کے ساتھ فی الجملہ وابستہ رہے۔ لیکن دوسروں کے بارے میں رواداری سے کام لے۔ زیرِ نظر

کتاب کے مؤلف نے مزید یہ محتاط روش اختیار کی ہے کہ انہوں نے نہ اپنے ذاتی مسلک و رجحان کو کہیں محسوس کرایا ہے اور نہ کسی خاص مسلک یا اس کے دلائل پر جرح و تنقید کی سعی کی ہے

اس کتاب کی ایک مزید قابلِ ذکر اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خاصی محنت کے ساتھ قریب قریب وہ ساری مختلف دعاؤں کو جمع کر دیا گیا ہے جن کا ارکان صلوٰۃ میں پڑھا جانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ مثلاً اس میں تکبیر تحریمہ کے بعد استفتاح و ثنا کے لیے تین اور رکوع کے لیے چار اذکار مسنونہ نقل کیے گئے ہیں اسی طرح قومہ میں پڑھی جانے والی چار ماثور دعائیں دے دی گئی ہیں۔ سجدہ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت شدہ سات دعائیں اور اسی طرح آخری تشہد میں سلام سے پہلے کی آٹھ ادعیہ مسنونہ جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے نماز کی دعاؤں کی حد تک اس مختصر کتاب میں ایسی جامعیت پیدا ہو گئی ہے۔ جو فقہ بلکہ حدیث کی عام کتابوں میں بھی مشکل ہی سے ملے گی ان دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی مختلف حالتوں میں ایک ہی طرح کی لگی بندھی دعاؤں کا التزام نہیں فرماتے تھے بلکہ بدل بدل کر متنوع دعائیں پڑھتے تھے اور ان کی تعلیم صحابہ کرام کو دیتے تھے۔ اگر ہم بھی ان ساری یا ان میں سے چند ایک دعاؤں کو یاد کر لیں اور انہیں باری باری اپنی نمازوں میں پڑھا کریں تو اتباعِ سنت کا اجر پانے کے ساتھ ساتھ ہماری نمازوں میں جو بعض اوقات بے خیالی، عدم خشوع اور عدم حضور سا پیدا ہونے لگتا ہے شاید اس کا بھی تدارک ہو جائے۔

کتاب کے دو تین مقامات پر بعض الفاظ اصلاح طلب نظر آئے۔ مثلاً ایک جگہ دباغت کی تشریح قوسین میں (داغ دینا) کی گئی ہے، حالانکہ دباغت داغ دینے سے مختلف ایک ایسا صنعتی عمل ہے جس سے چمڑے کی آلائشوں کو زائل کر کے اسے قابلِ استعمال بنایا جاتا ہے اسی طرح "ستر" اور "شرمگاہ کو ڈھانپنا" کے الفاظ کو مترادف قرار دے کر ستر کی بحث میں متعدد مقامات پر ستر کے بجائے شرمگاہ کو ڈھانپنے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ شرمگاہ کا لفظ اردو اور

فارسی میں قریب قریب عربی کے لفظ فرج کا قائم مقام ہے اور ستر ایک وسیع تر لفظ ہے جس میں جسم کا وہ سارا حصہ شامل ہے جس کا ڈھانپنا شریعت نے واجب یا مستحسن قرار دیا ہے اس مفہوم کے ساتھ چونکہ ستر کا لفظ اردو میں عام رائج ہے، اس لیے کسی مزید لفظ سے اس کی تشریح کی حاجت بھی نہیں ہے۔

بہرکیف اس طرح کے ایک آدھ تسامح سے قطع نظر فقہ السنۃ نہایت مفید اور سنجیدہ علمی مباحث اور معلومات پر مشتمل ہے اور اردو میں غالباً اپنی نوعیت کی پہلی منفرد کتاب ہے جو یقیناً اس قابل ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے اور اس کی قدر افزائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو اس کی تکمیل کی ہمت دے اور ان کی مساعی کو مشکور فرمائے۔ (غ۔ع)

قرآنی اخلاقیات (انگریزی) | تالیف جناب بشیر احمد ڈار صاحب، فیلو ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

شائع کردہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ قیمت ۲ روپے آٹھ آنے۔

زندگی کے معاملات کو جیب یا پیٹ کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے جو برے نتائج برآمد ہوئے ہیں انہیں ہر وہ شخص اچھی طرح جانتا ہے جس نے مغربی تہذیب و تمدن کا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے۔ مغربی اخلاق اپنے اندر کوئی معروضی اقدار نہیں رکھتا بلکہ یہ حالات و واقعات کے بدلنے کے ساتھ مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے اس لیے اس کے اندر کسی قسم کی پائیداری نہیں یہی وجہ ہے کہ سائنس نے انسان کو جو قوت فراہم کی ہے، اس سے بھی وہ کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ اس وقت اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مادہ پرستانہ اخلاق کے مقابلے میں اس نظامِ اخلاق کو پیش کیا جائے جس کا سرچشمہ انسانی عقل و فکر کی بجائے وحی و الہام ہو اور جو زندگی کے صرف ایک شعبے سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہو۔

جناب بشیر احمد ڈار صاحب نے اسی سمت میں ایک مفید اور ٹھوس قدم اٹھا کر نہایت اچھی خدمت سرانجام دی ہے۔ ان کے استدلال میں بڑا منطقی ربط اور تسلسل ہے

اور اس لیے ان کے خیالات میں کسی قسم کا ابہام پیدا نہیں ہوا مثلاً ایک مقام پر فرماتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ خیر و شر کا ایک معروضی معیار قائم کیے بغیر کسی فعل پر نیک و بد یا محمود و مذموم کا حکم لگا سکیں۔ اسلام کے نزدیک یہ معیار خدا کی ہستی کا اقرار اور اس کی رضا اور اس کے احکام کی پیروی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کا بلند ترین اخلاقی معیار یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں خدائی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے اور تمام انسانی اعمال اسی کسوٹی پر پرکھے جائیں۔ کتاب مجموعی طور پر مفید اور معلومات افزا ہے۔ خصوصاً انگریزی زبان میں ہونے کی حیثیت سے مغرب زدہ لوگوں کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

اسلام کا نظامِ عدل تالیف: استاذ سید قطب۔ مترجم مولانا محمد نجات اللہ صدیقی۔ شائع کردہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند محلہ کشن گنج دہلی، صفحات ۴۷۱، قیمت مجلد مع گرد پوش چھ روپے۔

استاذ سید قطب عالم اسلامی کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ آپ مصر کے ایک بڑے ادیب، الاخوان المسلمون کے چوٹی کے مفکر اور دنیائے اسلام کے ایک ایسے مصنف ہیں جن کے دینی و علمی مقالات کے فاضلانہ لب و لہجہ نے، سیاسی مضامین کے مجاہدانہ وقار نے اور مذہبی افکار کے حکیمانہ اسلوب نے ہر حلقے سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ پھر انہوں نے ناصر کے ظلم و استبداد کے سامنے جس پامردی اور استقلال کا ثبوت دیا ہے اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اسلامی تعلیمات پر کس قدر گہرا یقین ہے انہوں نے یوں تو بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے فی ظلال القرآن التصویر الفنی فی القرآن۔ مشاهد القیامه فی القرآن، معرکة الاسلام والراسمالیه، السلام العالمی والاسلام اور العدالة الاجتماعیة فی الاسلام خاص طور پر مشہور ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اسلام کا نظامِ عدل اسی موخر الذکر فاضلانہ تصنیف یعنی العدالة الاجتماعیة

فی الاسلام کا بڑا دل نشین ترجمہ ہے۔ فاضل مترجم نوجوانوں کے اُس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہیں جماعت اسلامی ہند کے ارباب بست وکشاد نے خاص تربیت دے کر اسلام کے فکری محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے تیار کیا ہے اور دنیائے اسلام فی الواقع ان سے بہت اچھی امیدیں وابستہ رکھتی ہے۔ جناب نجات اللہ صدیقی صاحب نے اس کتاب کو نہ صرف اردو میں منتقل کیا ہے بلکہ خود مصنف کو بھی اپنے بعض نظریات پر نظرثانی کرنے کی دعوت دی ہے خصوصاً وہ حصے جن کا تعلق امیر معاویہؓ اور بنو امیہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے ہے اور اسے مصنف کی حق پرستی کہئے کہ انہوں نے غور و فکر کے بعد ان حصوں میں کافی تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ یہ کتاب صرف ایک بے جان قسم کا تحقیقی کارنامہ نہیں بلکہ اس میں مصنف کے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ اُن کی خطیبانہ بلند آہنگی، سپاہیانہ رجز خوانی، مرد مجاہد کا سا اذعان و ایقان بھی نمایاں ہے، اور مترجم نے بڑی محنت وکاوش سے ان خوبیوں کو ترجمہ میں برقرار رکھا ہے سید قطب کے نزدیک دنیا جس قسم کے ہولناک تہذیبی بحران سے گذر رہی ہے اس نے اُسے اپنے مستقبل کے بارے میں سخت مایوس کر دیا ہے اور وہ کسی نئی تہذیب کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ وہ تہذیب جو اس کی روح کی بھی تسکین کر سکے اور اس کے جسمانی تقاضوں کو بھی اچھی طرح پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ فاضل مصنف نے واضح دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تہذیب صرف اسلام ہی ہے۔ لیکن اس کے لیے خود اسلامی معاشرے میں ایک ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جدید اسلامی قانون سازی کے مسائل پر بھی بعض بڑی فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔

دنیائے اسلام کے علمی سرمایہ میں ہم اس کتاب کو ایک قابلِ قدر اضافہ سمجھتے ہیں اور اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ کتاب کا معیار طباعت وکتابت عمدہ ہے۔ پاکستان میں اسے کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے اس کی کوئی صراحت نہیں۔

صرف ایک اسلام (حصہ اوّل) بجواب دو اسلام | تالیف: مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان

صفحات ۴۰۰ ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے صفحات ۱۷۴

زیر تبصرہ تصنیف مسٹر غلام جیلانی برق کی گمراہ کن کتاب "دو اسلام" کا مدلل جواب ہے اس کتاب میں فاضل مصنف نے اُن تمام اعتراضات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو برق صاحب نے حدیث کے متعلق اٹھائے ہیں۔ مواد کی تلاش اور تحقیق میں مولینا نے بڑی محنت اور کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب مواد، ترتیب، اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ البتہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے تبصرہ نگار کو ایک چیز صرف کھٹکی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس کتاب کو لکھتے ہوئے دورِ حاضر کے ایک نامور اسلامی مفکر اور خادمِ دین پر بعض مقامات پر بڑی بے جا چوٹیں کی ہیں۔ ہمیں مولینا جیسے نیک اور منصف مزاج شخص سے اس بات کی پوری توقع ہے کہ وہ آئندہ ایڈیشن میں ان حصوں کو حذف کر دیں گے۔ کتاب کا معیار کتابت اور طباعت اگر اس سے بلند ہوتا تو بہتر تھا۔

اردو ترجمہ تاریخ ابن خلدون (حصہ اول) مترجم ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور و پنجاب یونیورسٹی، محل فروخت: محمد شمس الدین تاجر کتب، چوک مینار انارکلی لاہور۔
قیمت جلد اول: دس روپے۔ صفحات ۴۰۴۔

تاریخ اسلام پر عربی زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون کی کتاب ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب چونکہ بالکل جدید طرز پر ہے اس لئے دورِ حاضر میں اسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ علامہ مرحوم نے اپنی اس تصنیف میں صرف واقعات جمع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان اسباب و علل کا بھی کھوج لگایا جن کی وجہ سے یہ واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو علامہ مرحوم نہ صرف مورخ ہیں بلکہ فلسفۂ تاریخ کے ایک فقید المثال عالم بھی ہیں۔ انہوں نے مختلف واقعات و حوادث کے جو داخلی محرکات بیان کیے ہیں۔ ان میں سے بعض سے اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہے مگر انہوں نے اس کام کو جس بصیرت سے سرانجام دیا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ قدر ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اسی فاضلانہ تصنیف کا نہایت شستہ ترجمہ ہے۔ فاضل مترجم نے علامہ مرحوم کی عبارتوں کو صرف اردو میں ڈھالنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس کتاب کے مختلف متون سامنے رکھ کر ان اغلاط کی بھی نشاندہی کی ہے جو مختلف ایڈیشنوں میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ترجمہ میں جا بجا حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ آغاز میں فاضل مترجم نے ۴۴ صفحات کا ایک مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں تاریخ اسلام کی ترتیب جدید کی ضرورت، اسلام کے مختلف مؤرخین اور ان میں سے علامہ ابن خلدون پر بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب اردو ادب میں ہر لحاظ سے ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ طباعت اور کتابت کا معیار عمدہ ہے۔

تفسیر الولی مصنفہ علامہ محمد ایوب صاحب دہلوی۔ شائع کردہ مطبع سعیدی قرآن محل کراچی، ضخامت ۳۰۷ صفحات۔ کتابت و طباعت کا معیار گوارا۔ قیمت درج نہیں ہے۔

"تفسیر الولی" اعوذ باللہ، بسم اللہ اور سورۃ الفاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف نے اردو میں تفسیر کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کو پڑھتے ہوئے متقدمین کے انداز تفسیر کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔ فاضل مصنف جب کسی آیت کے تفسیری مطالب بیان کرتے ہیں تو حدیث، لغت، نحو، کلام اور منطق سے لے کر طب اور اقلیدس تک سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور ضمناً فقہ کے احکام اور تصوف کے مسائل پر بھی روشنی ڈالتے جاتے ہیں۔ اور جب "میں کہتا ہوں" کے جملہ سے مخالفین کا جواب شروع کرتے ہیں تو وہی لطف پیدا ہو جاتا ہے جو امام رازی اور زمخشری کے "قال و اقول" میں پایا جاتا ہے۔ علامہ موصوف کی اس کوشش سے اگرچہ عام اردو دان طبقہ کم ہی استفادہ کر سکے گا مگر پڑھے لکھے حضرات اور بالخصوص عربی مدارس کے طلباء کے لیے نہایت مفید ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ صاحب اپنے اس سلسلۂ تفسیر کو آگے تک چلانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ زیر نظر حصہ کے اختتام میں لکھتے ہیں: "سورۃ فاتحہ کی مختصر تفسیر ختم ہوئی۔ اب ان شاء اللہ سورۃ بقرہ کی تفسیر شروع ہوگی۔"

ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ | شائع کردہ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ ۱۲۔ میری روڈ کراچی۔ بڑا سائز۔ ضخامت ۴۶۲ صفحات۔ قیمت سات روپے ۱۲ آنے۔

زیر نظر کتاب ہند و پاکستان کے اس مشہور صاحب علم و فضل خاندان کے ایک جلیل القدر فرد کے ملفوظات پر مشتمل ہے جس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱۵۹ھ — ۱۲۳۹ھ) امام الہند شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے لڑکے ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے تفسیر فتح العزیز، بستان المحدثین اور تحفہ اثنا عشریہ سے ہر ذی علم واقف ہے "ملفوظات" حضرت شاہ صاحب کے ان ارشادات کا مجموعہ ہے جو آپ نے وقتاً فوقتاً مجلس ارشاد و ہدایت میں بیان فرمائے ہیں۔ اور جنہیں آپ کے ایک مرید قلم بند کرتے گئے تھے۔ شروع میں شاہ صاحب کے حالات و سوانح پر مفصل مقدمہ ہے۔ اور پھر ملفوظات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن میں تاریخی واقعات علمی نکات، تزکیہ و تصوف کے مسائل اور شرعی احکام کا بیش بہا ذخیرہ سامنے آتا ہے۔ آخر میں "کمالات عزیزی" اور "مجربات عزیزی" کے عنوان سے دو ابواب کا اضافہ ہے "کمالات عزیزی" بھی آپ کے ملفوظات پر مشتمل ہے جنہیں آپ کے ایک اور مرید نے مرتب کیا تھا۔ اور "مجربات عزیزی" میں شاہ صاحبؒ کے خاندان کے ان مجرب اعمال و اوراد کا ذکر ہے جو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب القول الجمیل میں بیان کئے گئے ہیں۔ آثار سلف کا احیاء ملت اسلامی کی نہایت قابل قدر خدمت ہے ادارہ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز نے ملفوظات کا اردو ترجمہ شائع کر کے اپنے لیے بہت بڑی سعادت حاصل کر لی ہے اور اہلِ علم کی طرف سے شکریہ کا مستحق ہے۔

ادب اور اسلامی قدریں | تالیف جناب پروفیسر اسرار احمد خاں سہاروی، ناشر: مکتبہ چراغ راہ۔ کراچی ۱۔ صفحات ۱۰۸۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

پروفیسر اسرار احمد خاں سہاروی اس ملک کے اہل علم اور اہل قلم میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں انہوں نے اسلامی فلسفہ اور اسلامی ادب کے مختلف موضوعات پر بعض گراں قدر مقالات پیش کیے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "ادب اور اسلامی قدریں" بھی ان کے اس

موضوع کے متعلق چند نہایت جاندار مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں انہوں نے نہ صرف اسلامی ادب کے متعلق پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ نہایت سلجھے ہوئے اور حکیمانہ انداز میں انہوں نے اس ادب کے بعض اہم گوشوں کے متعلق بڑی فکر انگیز بحث بھی کی ہے۔

ہم ان تمام حضرات سے جنہیں اس موضوع سے دلچسپی ہے، اس کتاب کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

کتاب کا معیار کتابت اور طباعت گوارا ہے۔

قصۂ آدم و ابلیس تالیف: مولینا کوثر نیازی۔ ناشر- آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور صفحات ۱۴۴۔ قیمت تین روپے۔

ہماری حقیقت کیا ہے؟ ہمارا آغاز کس طرح ہوا؟ اور ہمارا انجام کیا ہوگا؟ یہ ہیں وہ سوالات جو ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب دیئے بغیر نہ تو کوئی تہذیب جنم لے سکتی ہے اور نہ ہی کوئی تمدن پروان چڑھ سکتا ہے۔ یہ انسانیت کے فطری سوالات ہیں اور ان کے بارے میں ہر شخص اپنے قلب و دماغ میں خلش محسوس کرتا ہے۔ آپ ان کے جوابات دینے میں جو موقف چاہیں اختیار کریں لیکن ان کے جوابات انسانیت کا اساسی اور بنیادی تقاضا ہیں۔ اسلام نے بھی ان امور پر بہت صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے سوالات کی اس فہرست میں ایک اہم سوال تخلیق آدم ہے۔ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں نہایت واضح طور پر بتایا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی۔ دورِ جدید میں بعض لوگوں نے مغرب کی تقلید میں یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے مراد کوئی فرد نہیں بلکہ انسانیت کی ابتدائی منزل ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑے علمی انداز میں ان حضرات کی پھیلائی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور ٹھوس دلائل کے ساتھ اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو انسانیت کی ابتدائی منزل سے تعبیر کرنا محض ابلہ فریبی ہے۔ جناب کوثر نیازی صاحب کی یہ محنت ہر اعتبار سے قابلِ ستائش ہے۔ کتاب کا معیار طباعت و کتابت نہایت عمدہ ہے

"نظامِ دین میں سنّت کا مقام کیا ہے؟"

اس کا مفصل اور مدلل جواب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے منصب رسالت نمبر

میں پیش کیا جا رہا ہے

اس میں انکار سنّت کے تمام دلائل اور اسکے تفصیلی جوابات آپ کو یکجا مل جائیں گے۔ یہ نمبر انشاءاللہ ستمبر ۱۹۶۱ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔ ضخامت (اندازاً) ۳۵۰ صفحات۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے

مندرجات ایک نظر میں

۱۔ فتنہ انکار حدیث کا تاریخی وفکری جائزہ از مولانا مودودی ۲۔ ڈاکٹر عبدالودود اور مولانا مودودی کے مابین مراسلت

۳۔ ڈاکٹر صاحب کا آخری خط اور اس کا جواب از مولانا مودودی۔

۴۔ سنّت اور اجتہاد کے بارے میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے ایک فاضل جج کے نظریات پر تبصرہ از مولانا مودودی

.... یہ اشاعت خاص سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم موضوع پر ایک تاریخی دستاویز اور ایک مستقل کتاب ہوگی۔

..... یہ نمبر تمام خریداروں کو بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے گا تاکہ ڈاک میں ضائع ہو جانے کا خطرہ نہ رہے

ابھی سے پرچہ محفوظ کرانے کے لیے

صرف اس اشاعت خاص کے خریدار مبلغ چار روپے صرف

ترجمان القرآن کے مستقل خریدار مبلغ دو روپے پچھتر پیسے

نئے مستقل خریدار سالانہ چندہ سمیت مبلغ ۸ روپے پچھتر پیسے

بذریعہ منی آرڈر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور میں روانہ فرماویں۔ اس رقم میں خاص نمبر کی قیمت اور رجسٹری کا خرچ (پچاس پیسے) دونوں شامل ہیں۔

مینجر رسالہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ کی نئی پیش کش

سُود

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

نہایت اہم مباحث کے اضافے اور مکمل نظرِ ثانی کے بعد

پہلی مرتبہ

نو ابواب — تین ضمیمے — ۴۱۰ صفحات

کتاب کے چند مباحث:

- اسلام، سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکیت کا اصولی فرق
- حرمتِ سود، ۱۔ سلبی پہلو ۲۔ ایجابی پہلو
- جدید بینکنگ — • سود کے متعلق اسلامی احکام
- کیا تجارتی قرضوں پر سود جائز ہے؟
- آڈیٹر جنرل حکومتِ پاکستان اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے درمیان قلمی مباحثہ
- ادارہ ثقافتِ اسلامی میں علماء اور جدید ماہرینِ اقتصادیات کے مابین سود کے متعلق آٹھ زیرِ بحث اہم سوالات کا مولانا مودودی کی طرف سے جواب

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۱۳۔ سی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور